تعلیم و تربیت

Sharjeel Ahmed

جنوری 1995ء

نیا سال مبارک

نیا سال مبارک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلامُ علیکمُ و رحمۃُ اللہ

تعلیم و تربیت کے تمام ساتھیوں کو نیا سال مُبارک ہو۔ اللہ کرے یہ سال آپ کے لیے اپنے دامن میں ڈھیر ساری خوشیاں لے کر آئے۔

ہمارے پیارے وطن پاکستان میں آج کل جو افراتفری مچی ہوئی ہے، اِس سے آپ باخبر ہوں گے۔ اللہ جانے اِس پاک سرزمین کو کس کی نظر لگ گئی ہے کہ اِس کے باسیوں کو کسی کل چین نہیں۔ ہر طرف مار دھاڑ اور لُوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ خاص کر کراچی کی حالت تو بہت ہی بُری ہے۔ وہاں تو کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ آٹھ دس آدمی ہلاک نہ ہوتے ہوں اور کوئی گھر، بینک یا دُکان نہ لُوٹی جاتی ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اِتنے طاقت ور تخریب کار اور وطن دُشمن لوگ کہاں سے آگئے ہیں کہ کسی کے قابُو میں نہیں آتے!

اللہ تعالیٰ معصُوموں کی دُعا جلد سُنتا ہے۔ آپ ہر نماز کے بعد خدا کے حضُور گڑگڑا گڑگڑا کر دُعا کیجیے کہ اے باری تعالیٰ! ہمارے وطن کو وطن دُشمنوں سے نجات دِلا اور پاکستان کو ویسا ہی پاکستان بنا دے جس کا خواب مُفکّرِ پاکستان علاّمہ اِقبال” اور بانیِ پاکستان قائدِاعظم محمّد علی جناح” نے دیکھا تھا۔

پچھلے سال، دسمبر میں، آپ کے اِسکولوں میں اِمتحان ہوئے تھے، اور اب نتیجہ نکلنے والا ہوگا۔ ہمیں اُمید ہے کہ آپ اچھے نمبروں سے پاس ہوں گے۔ اپنی کام یابی کی خوش خبری ہمیں ضرور سُنانا تاکہ ہم بھی آپ کی خوشیوں میں برابر کے شریک ہو سکیں۔

اس شمارے میں

اداریہ		1					
نیا سال مبارک (نظم)	فرحت شاہجہان پوری	2	آئی بسنت (اپیل)		24	آپ کا خط	46
حکیم صاحب کے ہیرے (کہانی)	سید نظر زیدی	3	حمد (نظم)	ڈاکٹر ابوالحسن زاہد	25	آیئے مسکرائیں (لطائف)	49
مرغ کے مہمان (کہانی)	محمد یونس حسرت	7	گھر تیلے گھنے لوگ	سلیم احمد صدیقی	26	آپ بھی لکھیے	50
نمونی (کہانی)	سعید لخت	15	سیاہ موت (کہانی)	ڈاکٹر رضوان ثاقب	29	آیئے دوست بنائیں	55
سیدھا راستہ (درسِ قرآن)	ڈاکٹر عبدالرؤف	18	سوا سو کی گھڑی (کہانی)	فاروق حسن چانڈیو	34		
ہ، پ کے چاہ زیادہ سوال کیجئے چاہ			الٹا پلٹ (کہانی)	اشفاق احمد خاں	38	ماں کا کلام (کہانی) سلیم خاں گمّی	58
	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر	19	دو سوال (کہانی)	اشفاق الرحمٰن	42	مجرم کون؟	64
ذرا سی غلطی (کہانی)	محمد فاروق انجم	21	علمی آزمائش		44		

54 واں سال
دسواں شمارہ

تعلیم و تربیت

...ں میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
...چوں کا محبوب رسالہ

...یٹر — عبدالسلام
— سعید لخت
...ٹ ایڈیٹر — رضوان ثاقب
...نر و ڈرائنگ — سید شوکت اعجاز
...سسٹنٹ — محمد بشیر راہی

...فیروز سنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ لاہور
ظہیر سلام
عبدالسلام

پتا
...نامہ تعلیم و تربیت
...شارع بن بادیس لاہور
6361309-6361310
6278815-6278816 ...

...سرکولیشن اور اکاؤنٹس
...شاہراہ قائدِاعظم لاہور

سالانہ قیمت
...بذریعہ رجسٹری کے ساتھ 225/- روپے
...فریقہ (ہوائی ڈاک سے) 435/- روپے
...ئی ڈاک سے) 625/- روپے
...بعید (ہوائی ڈاک سے) 650/- روپے

1995 جنوری

قیمت فی پرچہ ۔/15 روپے

سرورق: نیا سال

نیا سال مُبارک

سورج نِکلا، ہُوا سویرا، آیا سال نیا
خوشیاں اپنے دامن میں لایا سال نیا

پیارے بچّو، پھُول سے بچّو، پڑھو لِکھو، آزاد رہو
اپنے وطن کی خوش حالی میں شاد رہو، آباد رہو

تُم کو ترقّی کے میداں میں آگے بڑھتے جانا ہے
عِلم کو حاصِل کرنا ہے، قوم کی شان بڑھانا ہے

پڑھ لِکھ کر تُم کو اِک دِن اچّھا آدمی بننا ہے
چاند وطن کا ہونا ہے، قوم کی چاندنی بننا ہے

اچّھے آدمی سب کے لِیے اللہ کی رحمت ہوتے ہیں
دیس کی شان بڑھاتے ہیں، قوم کی عِزّت ہوتے ہیں

چھوٹے بڑوں کی خدمت سے تُم اِک دِن عظمت پاؤ گے
سب سے مِلو تُم، سب کے بنو تُم، پیار کی دولت پاؤ گے

پاک وطن کا ذرّہ ذرّہ تُم سے روشن ہو جائے
سب سے اچّھا، سب سے پیارا، پیار کا گُلشن ہو جائے

فرحت شاہ جہان پوری

بیگم صاحبہ کے ہیرے

سید نظر زیدی

بیگم صاحبہ ایک امیر بیوہ تھیں۔ مال و دولت کے علاوہ اللہ پاک نے اُنھیں نیک اولاد بھی دی تھی۔ اُن کی تینوں بیٹیوں اور دونوں بیٹوں کی شادی ہو چکی تھی اور وہ سب اپنے گھروں میں آباد تھے۔ بیٹیوں کو تو شادی کے بعد اپنے شوہروں کے ساتھ نئے گھروں میں رہنا ہی ہوتا ہے، لیکن اُن کے بیٹے بھی اپنی مُلازمتوں کے سلسلے میں دوسرے شہروں کو چلے گئے تھے۔ ایک ایبٹ آباد میں تھا، دوسرا اِسلام آباد میں۔ خدا کے فضل سے یہ دونوں ہی بڑے سرکاری افسر تھے اور اپنے بال بچّوں کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گُزار رہے تھے۔ اِن دونوں ہی کی خواہش تھی کہ ان کی والدہ صاحبہ اِن کے ساتھ رہیں لیکن بیگم صاحبہ اپنے اُس پُرانے گھر کو چھوڑنا نہ چاہتی تھیں، جس میں اُنھوں نے پوری زندگی گُزاری تھی۔ وہ کہتیں "بچّو، میری جنّت تو میرا یہی گھر ہے"۔

جس گھر میں وہ رہتی تھیں، وہ ہر طرح سے محفوظ تھا۔ پاس پڑوس میں شریف لوگ رہتے تھے، جو ہر طرح اُن کا خیال رکھتے تھے۔ اپنے طور پر بھی اُنھوں نے گھر کی حفاظت کا خوب اِنتظام کر رکھا تھا۔ اور یوں اُن کی زِندگی بہت اِطمینان سے گزر رہی تھی۔

عشا کی نماز پڑھنے کے بعد وہ گھر کے سب دروازے خود بند کرتی تھیں، ساتھ ہی چوکیدار آجاتا تھا اور ہر طرح سے اطمینان کر کے وہ اپنے بیڈ روم میں چلی جاتی تھیں۔

اس طرح اِطمینان بھری زندگی گُزارتے ہوئے سات آٹھ سال گزر گئے تھے اور اُن کے گھر سے کسی نے ایک تنکا تک نہ اُٹھایا تھا۔ لیکن ایک دن وہ سو کر اُٹھیں تو اُنھیں یوں لگا جیسے کسی نے گھر کی چیزوں کو اُلٹ پلٹ کیا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ گھبرا گئیں اور جلدی سے اُس الماری کو دیکھا جس میں اُن کے زیورات اور روپے رکھے تھے۔ الماری کا تالا کُھلا ہوا تھا اور ساری قیمتی چیزیں غائب تھیں۔

اُن دنوں اُن کے چھوٹے بیٹے کی بیوی اور بچّے آئے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے اپنی بہو کو بُلایا۔ صاف ظاہر تھا چوروں نے اُنھیں اُن کی قیمتی چیزوں اور کئی ہزار روپوں سے محروم کر دیا تھا۔ پہلے تو گھبراہٹ میں بہو کی سمجھ میں بھی کچھ نہ آیا کہ کیا کرے۔ لیکن جب پُوری بات سمجھ میں آئی

تو تھانے ٹیلی فون کر کے اِطلاع دی کہ ہمارے گھر میں چوری ہوگئی ہے۔

اگر بیگم صاحبہ کی بہو یعنی اُن کے بیٹے کی بیوی نہ ہوتی تو اُن کا بُرا حال ہو جاتا۔ ایک تو اِس لیے کہ اُن کا بہت بڑا نقصان ہوگیا تھا، دوسرے اِس سے پہلے اُن کے گھر میں ایسا واقعہ نہ ہُوا تھا۔ بہو نے اُنھیں تسلّی دی کہ آپ فکر نہ کیجیے۔ ابھی پولیس آجائے گی اور اِن شاء اللہ چور پکڑے جائیں گے۔ بیگم صاحبہ کچھ مُطمئن ہوگئیں۔

جیسا کہ بیگم صاحبہ کی بہو نے کہا تھا، ٹیلی فون کرنے کے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد پولیس کا ایک حوالدار اور تین چار سپاہی آگئے اور تحقیقات شروع کردی کہ چور کس طرح گھر میں داخل ہوئے اور اُنھوں نے زیورات اور نقد روپوں کے عِلاوہ اور کیا کیا چیزیں چُرائیں۔ معلوم ہُوا کہ وہ تو رنگین ٹیلی ویژن، قیمتی برتن اور کپڑے وغیرہ بھی لے گئے ہیں۔ حوالدار نے تحقیقات کرنے کے بعد چوری ہونے والی چیزوں کی فہرست بنائی، الماری اور گھر کے کئی حِصّوں کی

تصویریں لیں اور تسلّی دے کر چلا گیا کہ چور جلد ہی گرفتار کر لیے جائیں گے اور آپ کا وہ سب سامان مِل جائے گا جو چوری ہُوا ہے۔

حوالدار کے جانے کے بعد بیگم صاحبہ کی بہو نے اپنے شوہر اور جیٹھ یعنی بیگم صاحبہ کے بڑے بیٹے کو ٹیلی فون کر کے گھر میں چوری ہو جانے کی اِطلاع دی۔ دونوں بیٹوں نے اپنی بہنوں کو بھی اِس واقعے کی اِطلاع دے دی اور یوں چند دنوں ہی میں پورا خاندان اِکٹھا ہوگیا۔

بیگم صاحبہ اور اُن کے گھر والوں کے لیے تو یہ واقعہ بہت ہی خاص تھا۔ وہ تو چاہتے تھے کہ چور فوراً ہی پکڑے جائیں اور اُن کی ساری چیزیں جلد سے جلد اُنھیں مِل جائیں، لیکن پولیس کے لیے یہ واقعہ نہ نیا تھا نہ نِرالا۔ شہر میں چوریاں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ چُناں چہ اُس نے چوری کی رپورٹ درج کرنے کے بعد اُسی طرح تفتیش شروع کردی جیسے اِس قسم کے واقعات کی کی جاتی ہے۔

پہلے تو پولیس نے بیگم صاحبہ اور اُن کے بیٹوں پر زور دیا کہ وہ اُن لوگوں کے نام بتائیں جن پر اُنھیں شُبہ ہو کہ چوری اُنھوں نے کی ہوگی۔ پھر ایسے لوگوں کو تھانے بُلا کر مار پیٹ شروع کردی جو کسی جُرم میں سزا کاٹ چکے تھے۔ لیکن اِس ساری کارروائی کا کچھ بھی نتیجہ نہ نکلا۔ نہ چور پکڑے گئے نہ چوری ہونے والا سامان ملا۔

اگر بیگم صاحبہ کے بیٹے سرکاری افسر نہ ہوتے تو پولیس کے افسر اُن سے کہہ دیتے کہ بی بی جی، اِنتظار کیجیے۔ ہم چوروں کو تلاش کر رہے ہیں۔ جب وہ پکڑے جائیں گے تو آپ کا سامان مِل جائے گا۔ لیکن اب ایسا نہ ہو سکا۔ بیگم صاحبہ کے دونوں بیٹوں اور تینوں دامادوں نے عِلاقے کے تھانے دار سے کہا "چوروں کا کھوج لگا کر جلد سے جلد ہمارا مال برآمد کیجیے، ورنہ ہم بڑے افسروں کو اِطلاع دے دیں گے اور آپ کی نوکری خطرے میں پڑ جائے گی"۔

اگرچہ پولیس میں سبھی طرح کے لوگ بھرتی ہوگئے ہیں۔ رشوت لینے والے بھی ہیں اور ایسے نالائق بھی جو

لوگوں کو مارنے پیٹنے کے سوا کچھ جانتے ہی نہیں۔ ایسے بھی ہیں جو ترقی لینے کے لیے بے گناہ لوگوں کو سزا دِلوا دیتے ہیں۔ لیکن یہ تھانیدار صاحب ایسے نہ تھے۔ وہ ایمان دار اور نیک دِل ہونے کے ساتھ بہت عقل مند بھی تھے۔ اُنھوں نے بہت سے خطرناک مجرموں کو پکڑا تھا اور اُنہیں سزا دِلوائی تھی۔ لیکن یہ مُعاملہ ایسا تھا کہ حد سے زیادہ کوشش کرنے کے باوجود وہ چوروں کے بارے میں کچھ معلوم نہ کر سکے تھے۔

اب اُنہیں اُوپر کے افسروں سے شکایت کرنے کی دھمکی دی گئی تو وہ بہت فکر مند ہوئے۔ اُنہیں اِس بات کا اندازہ تھا کہ یہ لوگ بڑے سرکاری افسروں سے میری شکایت کریں گے تو میری نوکری خطرے میں پڑ جائے گی۔ اعلیٰ افسر مجھے نالائق خیال کریں گے اور اگر مجھے نوکری سے نہ بھی نکالا تو میرا عہدہ ضرور کم کر دیں گے۔

ایک دن یہ نیک دل تھانیدار صاحب اِسی فکر میں بیٹھے تھے کہ اُن کا بیٹا احمد اُن کے پاس آیا اور ادب سے بولا "ابّاجان' میں کئی دن سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ بہت پریشان ہیں۔ کیا کوئی خاص واقعہ ہو گیا ہے؟"

تھانیدار صاحب مسکراتے ہوئے بولے "ہاں بیٹے' کچھ ایسی ہی بات ہے۔ لیکن تم کسی طرح کی فکر نہ کرو۔ جو پریشانی ہے ہم اُسے دور کرنے کی کوئی ترکیب سوچ ہی لیں گے"۔

احمد بولا "ابّاجان' کہیں آپ اُس چوری کی وجہ سے تو پریشان نہیں ہیں جو بیگم صاحبہ کے گھر ہوئی ہے؟"

"ہاں' بیٹے۔ اُسی کی وجہ سے ہم پریشان ہیں۔ ہم نے اپنے طور پر بہت کوشش کی ہے لیکن چوروں کا پتا نہیں چل رہا' اور اب یہ مُعاملہ ہمارے افسروں تک لے جایا جا رہا ہے۔ اگر ایسا ہُوا تو ہمیں نُقصان پہنچے گا" تھانیدار صاحب نے کہا۔

"لیکن ابّاجان' وہ چور گرفتار ہو سکتے ہیں" احمد بولا۔

"کس طرح؟" تھانیدار صاحب نے چونک کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔

احمد بولا "ابّاجان' جس دن سے یہ واقعہ ہوا ہے' میں اِس کے بارے میں برابر سوچ رہا ہوں' اور خدا کے فضل سے میرے ذہن میں ایک ایسی ترکیب آئی ہے کہ وہ چور ضرور گرفتار ہو جائیں گے جنھوں نے بیگم صاحبہ کو لُوٹا ہے"۔

"تو وہ ترکیب جلدی سے ہمیں بتاؤ۔ اگر چور پکڑے گئے تو یہ تمہارا بہت بڑا کارنامہ ہوگا اور تمہیں اِنعام ملے گا"۔

احمد بولا "ابّاجان' پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ بیگم صاحبہ کے بیٹوں اور دوسرے سب رشتے داروں سے کہیئے کہ وہ فوراً اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں"۔

"تمہارا مطلب ہے' بیگم صاحبہ بالکل اکیلی رہ جائیں؟" تھانیدار صاحب نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"جی' ابّاجان۔ چوروں کو پکڑنے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے" احمد نے یقین بھری آواز میں کہا۔

"اچھّا چلو' یہ کام ہو گیا۔ اِس کے بعد کی بات بتاؤ؟" تھانیدار صاحب نے کہا۔

"اِس کے بعد کی بات یہ ہے کہ آپ بیگم صاحبہ کی اِس چوری کے بارے میں شہر کے سب اخباروں میں یہ خبر

چھپوا دیجیے کہ پولیس اِنتہائی کوشش کے باوجود چوروں کو تو گرفتار نہیں کر سکی، لیکن اِس سِلسِلے میں خوشی کی بات یہ ہے کہ چور بیگم صاحِبہ کے وہ قیمتی ہیرے چُرانے میں ناکام رہے جو اُسی الماری کے ایک خانے میں رکھے تھے جِس میں زیورات اور نقد روپے تھے۔ یہ خبر چھپوانے کے بعد آپ بیگم صاحبہ کے مکان کے آس پاس اپنے سپاہی اِس طرح چُھپا دیجیے کہ اُن کے بارے میں آپ کے تھانے کے لوگوں کو بھی کچھ معلوم نہ ہو۔ مجھے پکّا یقین ہے کہ یہ خبر چھپنے کے بعد وہ چور بیگم صاحِبہ کے گھر پھر آئیں گے اور ہیرے چُرانے کی کوشش کریں گے۔ فرمائیے، ہے نا شان دار ترکیب؟" احمد نے بہُت فخر سے کہا۔

تھانیدار صاحِب خوش ہو کر بولے "ہاں، بھئی۔ بہُت شان دار ترکیب ہے۔ اب ضرورت اِس بات کی ہے کہ چور ویسے ہی لالچی اور احمق ہوں جیسا تم اُنہیں سمجھ رہے ہو۔"

"ابّاجان، چور احمق بھی ہوتے ہیں اور لالچی بھی" احمد نے یقین سے کہا۔

احمد کی عُمر اگرچہ کم تھی، لیکن اُس نے ترکیب ایسی شان دار بتائی تھی کہ تجربہ کار تھانیدار صاحِب کو وہ بِالکُل ٹھیک معلوم ہوئی۔ اُنہوں نے بیگم صاحِبہ کے بیٹوں اور رشتے داروں سے کہا کہ وہ سب اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں اور پھر اُنہوں نے دوسرے ہی دِن تمام اخباروں میں بیگم صاحِبہ کے ہیروں کے بارے میں خبر چھپوا دی۔

ہمارا خیال ہے، یہ کہانی پڑھنے والے بچّے یہ جاننے کے لِیے بے چین ہوں گے کہ احمد کا اندازہ ٹھیک نِکلا یا غلط۔ تو بھئی، آپ کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ اُس کا اندازہ بِالکُل ٹھیک نِکلا۔ خبر چھپنے کے دوسری رات ہی لالچی اور احمق چور بیگم صاحِبہ کے گھر میں داخل ہوئے اور رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔

اِس سے اگلے دن سارے اخبارات نے احمد کی تصویر کے ساتھ یہ خبر شائع کی کہ اِس عقل مند لڑکے کی بتائی ہوئی ترکیب سے چوروں کا ایک بہُت خطرناک گروہ پکڑا گیا ہے۔ حکومت نے احمد کو بھاری اِنعام دینے کا اِعلان کیا اور بیگم صاحِبہ کو اُن کی وہ سب چیزیں بھی مل گئیں جو چوری ہوئی تھیں۔ رہ گئے چور، تو اُن کا وُہی انجام ہُوا جو چوروں کا ہُوا کرتا ہے یعنی اُن پر مُقدّمہ چلا اور اُنہیں سخت سزائیں دی گئیں۔

دوسری قسط

تحریر: جیا پراماسیون
ترجمہ: محمد یونس حسرت

مریخ کے مہمان

اب تک کی کہانی

میکی اپنے دوست رُونی کے ساتھ چھٹیاں گزارنے اپنے انکل، مسٹر بیرن، کے پاس جاتا ہے۔ مسٹر بیرن ایک دُور دراز پہاڑی پر اپنے بنگلے میں تنہا رہتے ہیں۔ ایک دن اُنہوں نے لڑکوں سے کہا "تم کبھی مشرقی پگ ڈنڈی کی طرف بھی گئے ہو؟ یہ پگ ڈنڈی بہت کم اِستعمال ہوتی ہے اور بہت سے لوگوں کو تو اِس کا علم بھی نہیں۔ وہاں سیر کا بہت لُطف آتا ہے۔ اِس کے آخری سِرے پر لکڑی کا ایک پُرانا کیبن ہے۔ اگر دیر ہو جائے تو تم اُس کیبن میں رات گزار سکتے ہو"۔

دونوں دوست اُس پگ ڈنڈی کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ وہ کافی بلندی پر تھی اور اُس تک پہنچنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ لیکن اُنہوں نے ہمّت نہ ہاری اور گرتے پڑتے اُوپر چڑھتے چلے گئے۔ اب شام کا دُھندلکا پھیلنے لگا تھا کہ اچانک ایک غار میں سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی "آہ! ہائے! ہائے!" وہ غار کے اندر گئے اور ڈرتے ڈرتے ٹارچ کی روشنی اُس کراہنے والی مخلوق پر ڈالی تو حیرت اور خوف سے اُچھل پڑے۔ غار کے کونے میں ایک عجیب و غریب وجُود، جو نہ تو اِنسان تھا اور نہ حیوان، پڑا کراہ رہا تھا۔ اُس نے بڑی مشکل سے، رُک رُک کر، بتایا کہ اُس کا نام ایاس ہے اور وہ سیّارہ مِریخ سے آیا ہے۔ اِتنا کہہ کر اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ سو گیا تھا۔

اب رات کافی ہو گئی تھی۔ چُناں چہ میکی اور رُونی نے فیصلہ کیا کہ وہ رات اِسی غار میں گزاریں گے اور صبح کو ایاس سے پُوچھیں گے کہ وہ اُن کے سیّارے (زمین) پر کیوں آیا ہے۔ وہ اپنے اپنے سلیپنگ بیگوں میں گھُس کر سو گئے۔ اب آگے پڑھیے۔

"اوہ!"

کوئی سرد سرد چیز میکی کے ماتھے سے مَس ہوئی تو وہ خوف سے اُچھل پڑا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ صبح ہو چکی ہے اور غار کے باہر دِن کا اُجالا پھیل رہا ہے۔ ایاس اُس کے قریب ہی ایک پتّھر پر بیٹھا تھا، اور اپنی سرد سرد اُنگلیوں سے اُس کی پیشانی کو چھُو رہا تھا۔ صبح کے ملگجے اُجالے میں اُس کی نیلی نیلی آنکھیں نیلم کی طرح چمک رہی تھیں۔

"صبح بخیر، میکی" ایاس نے مسکراتے ہوئے کہا، پھر وہ رُونی کی طرف مُڑا اور اُس کی پیشانی کو بھی اپنی سرد سرد اُنگلیوں سے چھُوا۔ رُونی ایک دم اُٹھ بیٹھا اور کہنے لگا "باپ رے! یہ تو صبح ہو چکی ہے"۔ پھر اُسے اِحساس ہوا کہ ایاس اُس کے بالکل قریب کھڑا ہے۔

"صبح بخیر، رُونی" ایاس نے بڑی نرمی اور مُلائمت سے کہا۔ رُونی اور میکی نے جواب میں صبح بخیر کہا اور پھر حیرت سے ایاس کو دیکھنے لگے۔ رات کے تھکے ماندے اور کم زور کم زور سے ایاس کی بجائے اُن کے سامنے ایک ایسا ایاس کھڑا تھا جو بالکل تندرست نظر آتا تھا۔ اُس میں رات والی تھکاوٹ اور کم زوری کا اب نام نشان تک نہ تھا۔

"آپ کو نیند تو آرام سے آئی، جناب؟" میکی نے سلیپنگ بیگ تہ کرتے ہوئے ایاس سے پوچھا۔

"ہاں' اور اِس کے لِیے تُم دونوں کا بُہت بُہت شکریہ" ایاس نے نرمی سے کہا "رات بھر آرام کے بعد میں اب اپنے آپ کو بِالکُل ٹھیک ٹھاک محسوس کر رہا ہوں"۔

رُونی اور میکی نے اپنے تھیلوں سے پانی کی بوتلیں نکال کر چہروں پر پانی کے چھینٹے دِیے اور پھر ناشتے کا سامان نکالا۔

"لیجیے' جناب۔ آپ بھی چائے سے شوق فرمایئے" رُونی نے ایاس کو دعوت دیتے ہوئے کہا مگر ایاس نے بڑی نرمی سے نفی میں سر ہلا دیا اور اُنہیں ناشتا کرتے ہوئے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ ناشتے سے فارِغ ہوتے ہی رُونی کے ہونٹوں پر وہ سوال خود بخود اُچھل کر آگیا جس نے اُن دونوں کو بے قرار کیا ہُوا تھا۔

"اب یہ بتائیں جناب' کہ آپ یہاں زمین پر کس لِیے تشریف لائے ہیں؟"

ایاس نے مسکراتے ہوئے اپنی نرم کھنکھناتی آواز میں جواب دیا "میں جانتا ہوں کہ تم یہ جاننے کے لِیے سخت بے تاب ہو کہ میرے سیّارے کے لوگ کیسے ہیں اور میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ میں اپنے سیّارے مِریخ کا ایک خلائی سائنس دان ہُوں' اور میرا کام چُوں کہ خلائی تحقیق سے تعلّق رکھتا ہے اِس لِیے میرا دوسرے سیّاروں پر اکثر آنا جانا رہتا ہے۔ یہاں میں تمہیں یہ بتاتا چلوں کہ ہم لوگوں نے سائنس اور خاص طور پر خلائی ٹیکنالوجی میں بے حد ترقّی کی ہے اور ہم نے نظامِ شمسی کے تقریباً تمام سیّاروں کا تفصیلی مُطالعہ اور مُشاہدہ کیا ہے"۔

اِتنا کہہ کر ایاس نے ذرا دم لیا اور پھر رُونی اور میکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا "زمین چُوں کہ مِریخ کے قریب ہے' اِس لِیے ہم اِس کا مُطالعہ اور مُشاہدہ کرنے کے لِیے اکثر یہاں اُترتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار زمین کے سائنس دان اور دوسرے لوگوں کو بھی ہمارے یہاں آنے کا پتا چل جاتا ہے۔ وہ ہمارے خلائی جہازوں کو اُڑن طشتریاں کہتے ہیں"۔ یہ کہہ کر ایاس نے پھر ذرا دم لیا۔ اِس کے بعد مسکراتے ہوئے کہنے لگا "میں مِریخ کے اُن خاص سائنس دانوں میں سے ایک ہُوں جنہیں اپنا خلائی جہاز خود اُڑانے اور چلانے کی تربیت دی گئی ہے۔ ہم خلا میں سفر کرنے کے لِیے جو خاص لباس پہنتے ہیں' اُس پر کسی بھی سیّارے کی مقناطیسی کشش یا کششِ ثقل کا اثر نہیں ہوتا"۔

یہ کہتے ہوئے ایاس نے اپنے ڈھیلے ڈھالے چوغے کی طرف اِشارہ کیا۔ وہ کسی ایسی موٹی چیز کا بنا ہُوا تھا جس میں سے حرارت اور بجلی نہیں گزر سکتی تھی۔ پھر اُس نے اپنی کمر کی چوڑی پیٹی میں بندھے ہوئے ڈبّے کو اُنگلیوں سے چھُوتے ہوئے کہا:

"اور یہ ڈبّا--- یہ قیمتی ڈبّا--- اِس میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں جو ضرورت کے وقت ہمارے کام آسکتی ہیں"۔

یہ کہہ کر ایاس کے چہرے پر اُداس سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ رُونی اور میکی پُوری توجّہ اور دھیان سے اُس کی باتیں سُن رہے تھے۔ اُس نے ایک آہ بھر کر کہا:

"اِس کائنات میں نیکی اور بدی' اُجالے اور اندھیرے کی طرح' ساتھ ساتھ پائی جاتی ہیں۔ ہمارے سیّارے میں بھی جہاں اچھے لوگ ہیں' وہاں بُرے لوگ بھی ہیں جو چھوٹے بڑے ہر قسم کے جُرم کرتے ہیں۔ مگر ہم مُجرموں کو بڑی سخت سزائیں دیتے ہیں۔ پچھلے دنوں مُجرموں کے ایک گروہ کی وجہ سے ہمارے ہاں مُجرمانہ سرگرمیوں میں خطرناک حد تک اِضافہ ہو گیا تھا اور ہمارے قومی سلامتی کے ذمّے دار اِداروں نے اِس گروہ کے تمام لوگوں کو گرفتار کر لیا تھا۔ مگر اِس گروہ کا سرغنہ "قراس" کسی طرح قانون کی گرِفت سے بچ نکلنے میں کام یاب ہو گیا۔ وہ کسی مُحافظ کی غفلت سے فائدہ اُٹھا کر ہمارے خلائی تحقیقاتی اِسٹیشن میں داخِل ہُوا اور پھر میرے خلائی جہاز میں آ چُھپا۔ مجھے اپنے خلائی جہاز میں اُس کی موجودگی کا پتا اُس وقت چلا جب میں خلائی تجربات کے سلسلے میں اُس میں بیٹھ کر مرِیخ سے روانہ ہو چکا تھا"۔

ایاس نے تھوڑی دیر رُک کر دم لیا' پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "قراس نے مجھے جان سے مار دینے کی دھمکی دی اور کسی اور سیّارے کی طرف جانے کا حکم دیا۔ چُوں کہ زمین مرِیخ سے قریب ہے' اِس لیے میں نے کسی اور سیّارے پر جانے کی بجائے اپنا خلائی جہاز یہاں اُتار لیا"۔

"پھر کیا ہُوا؟" رُونی نے بے تابی سے پُوچھا۔

"میں اِسی طرف آ رہا ہُوں" ایاس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "جب میں نے خلائی جہاز کو زمین پر اُتارا تو قراس نے جلدی سے خلائی جہاز میں رکھا ہُوا خلائی سُوٹ پہن لیا اور ہم دونوں جہاز سے باہر آ گئے۔ قراس کا کہنا تھا کہ ہم دونوں اُس وقت تک زمین پر رہیں گے جب تک مرِیخ میں اُس کی تلاش کا مُعاملہ ٹھنڈا نہیں پڑ جاتا۔ اُس نے مجھے تنبیہہ کی کہ میں کوئی چال چلنے کی کوشش نہ کروں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اُس کی باتوں نے سخت خوف زدہ کر دیا تھا"۔ یہ کہتے ہوئے ایاس نے اپنے ہاتھوں کی مُٹھیاں بھینچ لیں۔ پھر کہنے لگا "لیکن میں جانتا تھا کہ وہ مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرے گا' کیوں کہ وہ خلائی جہاز چلانا نہیں جانتا اور اُسے یہاں سے واپس مرِیخ جانے کے لیے میری مدد درکار ہو گی"۔

ایاس نے یہ کہہ کر ذرا دم لیا' پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "جب ہم خلائی جہاز سے نکل کر باہر آئے تو تھوڑی دیر ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پھر میں نے اچانک ایک طرف کو دوڑ لگا دی۔ قراس کو اِس کی بالکُل توقّع نہ تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے تو حیران رہ گیا اور پھر وہ بھی میرے پیچھے دوڑ پڑا۔ مجھے جو وقفہ مِل گیا تھا' میں اُس میں اِتنی دُور نکل آیا تھا کہ قراس مجھے پکڑ نہیں سکتا تھا' چُناں چہ اُس نے اپنی لیزر گن سے مجھ پر فائر کیا جس سے میرے کندھے اور پسلیاں دونوں زخمی ہو گئے۔ مگر زخمی ہونے کے باوجود میں گرا نہیں' اندھا دُھند آگے بڑھتا رہا اور قراس کی پہنچ سے دور نکل گیا۔ مگر پھر ایسا ہوا کہ جلدی میں آگے نہ دیکھ سکا اور اِس گڑھے میں گر پڑا"۔

اِتنا کہہ کر ایاس نے پھر ذرا دم لیا۔ اِس کے بعد بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میں گرتے ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ خاصی دیر بعد ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو اِس غار کے پاس پڑا پایا۔ چُناں چہ میں رینگتا ہوا اِس غار میں آ گیا۔ مگر یہ دیکھ کر میری مایوسی کی کوئی حد نہ رہی کہ دواؤں کا ڈبّا میری کمر کی پیٹی سے کھُل کر کہیں گر گیا تھا۔ مجھ میں اِتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ غار سے باہر نکل کر اُس ڈبّے کو تلاش کروں۔ اُسی وقت مجھے باہر تمہارے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ مجھے یہ جاننے میں کوئی دُشواری پیش نہیں آئی کہ یہ قدم قراس کے نہیں ہیں۔ چُناں چہ میں نے اِنسانوں کی

نظروں میں آجانے کا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا اور کراہتے ہوئے تمہیں اپنی طرف مُتوجّہ کرنے کی کوشش کرنے لگا"۔

"یہ واقعہ کب پیش آیا تھا؟" میکی نے پُوچھا۔

ایاس نے میکی کا سوال سُن کر اپنی کلائی پر بندھے ہوئے فیتے کی طرف دیکھا اور پھر کہا "تمہاری زمین کے وقت کے حساب سے یہ واقعہ کل صبح کے وقت پیش آیا تھا"۔

"اِس کا مطلب یہ ہُوا کہ آپ کو یہاں آئے 24 گھنٹے ہوگئے ہیں" رُونی نے کہا۔

"ہاں" ایاس نے جواب دیا۔

"اور اِس کا مطلب یہ بھی ہے کہ قراس اِن پہاڑیوں اور درختوں ہی میں کہیں گھات لگائے بیٹھا ہوگا کہ کب آپ اُسے دکھائی دیں اور کب وہ آپ کو دبوچ لے" میکی نے کہا۔

"ہاں" ایاس نے کہا "وہ بڑا کمینہ ہے۔ کمینہ بھی اور طاقت ور بھی۔ لیکن وہ بِلا ضرورت اِنسانوں سے اُلجھنے کا خطرہ مول نہیں لے گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ خلائی جہاز کے آس پاس ہی کہیں چُھپا بیٹھا ہوگا کیوں کہ اُسے معلوم ہے کہ میں مِریخ واپس جانے اور وہاں سے مدد لانے کے لِیے اِسی جہاز کو اِستعمال کروں گا۔ خیر----"

ایاس کچھ کہتے کہتے رُک گیا جیسے بات مُنہ سے نکالتے نکالتے کچھ سوچنے لگا ہو۔ پھر اُس نے اُن دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم دونوں شاید یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہے ہوگے کہ اب میرے اِرادے کیا ہیں اور میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ ایک بات بہرحال صاف ہے' اور وہ یہ کہ مجھے کسی نہ کسی طرح قراس پر قابو پانا ہوگا یا پھر اُس کے بغیر خلائی جہاز میں داخل ہونا ہوگا مگر............"

وہ پھر کچھ کہتے کہتے رُک گیا اور اُن دونوں کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے اُن سے پُوچھنے لگا "مگر تم اِن وِیران' سُنسان پہاڑیوں میں کیسے آگئے؟ تمہارا گزُر اِس طرف کیسے ہُوا؟ یہاں تو مُشکِل ہی سے کسی اِنسان کی شکل دیکھنے میں آتی ہے"۔

"ہم تو چُھٹیاں گزارنے یہاں آئے ہیں" میکی نے کہا "میرے انکل نے مشرقی پگ ڈنڈی کی سیر کی بات کی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ اِس پگ ڈنڈی کے سِرے پر لکڑی کا ایک کیبن بنا ہوا ہے جہاں رات گزاری جا سکتی ہے"۔

"لکڑی کا کیبن؟" ایاس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "مجھے یاد آ رہا ہے کہ جب میں قراس کی گرفت سے نکل کر بھاگا تو میرا گزر ایک لکڑی کے کیبن کے پاس سے بھی ہوا تھا۔ جس جگہ ہم نے خلائی جہاز 'اتارا تھا' وہ کیبن اُس جگہ کے قریب ہی ہے"۔

پھر وہ فِکر مند نظروں سے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا "تمہارا وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں۔ ممکن ہے قراس اُسی کیبن میں چُھپا ہُوا ہو"۔ یہ کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگا اور تھوڑی دیر بعد کہنے لگا "تم دونوں واپس گھر کیوں نہیں چلے جاتے؟ اِدھر آنا چاہو تو دو چار دن بعد آجانا۔ اُس وقت تک اُمّید ہے میرا اور قراس کا مسئلہ حل ہو چکا ہوگا"۔

"نہیں" رُونی نے کہا "ہم یہاں گھومے پِھرے بغیر واپس نہیں جائیں گے"۔

"اور پھر" میکی نے کہا "ہم آپ کو اِس حالت میں چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتے۔ ہم آپ کی مدد کرنے کی کوشش کریں گے۔ قراس کو پکڑنے کے لِیے آپ سے پُورا پُورا تعاوُن کریں گے۔ یہ اب ایک طرح سے ہمارا فرض ہے۔ کیوں رُونی؟ میں ٹھیک کہہ رہا ہُوں ناں؟" اور رُونی نے تائید میں سر ہلا دیا۔

ایاس نے سر ہلاتے ہوئے کہا "نہیں۔ میں تم دونوں کی جان خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ تم زمین کے رہنے والے انسان ہم مریخیوں کی طاقت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ ہمارا کم زور سے کم زور مریخی بھی تمہارے طاقت ور سے طاقت ور انسان سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے' اور تم تو محض بچّے ہو۔ تمہیں تو وہ یُوں چُٹکیوں میں مروڑ کر رکھ دے گا جیسے تم چیونٹیوں کو مسل دیتے ہو۔ تم نے میری

امداد کی ہے' وہی کافی ہے' اور میں اس کے لیے تمہارا احسان مند ہوں"۔

چُوں کہ ایاس اب اُن کی مدد قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا' اس لیے انُھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے پروگرام کے مُطابق لکڑی کے کیبن کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔

ایاس نے اُنھیں وہاں جانے سے منع کیا' کیوں کہ اُسے خطرہ تھا کہ کہیں اُن کا سامنا قراس سے نہ ہو جائے۔ مگر وہ دونوں اس خطرے کے باوجود وہاں جانے پر تُلے ہوئے تھے۔

"اچھا" ایاس نے کہا "اگر تمہارے ارادے یہی ہیں تو میں تمہیں وہاں جانے سے نہیں روکتا۔ البتہ تم میری طرف سے ایک ایسی چیز ضرور لیتے جاؤ جو قراس کا سامنا ہونے یا اس سلسلے میں کسی پریشانی یا مُصیبت میں پھنس جانے کی صورت میں مجھے خبردار کر سکے گی"۔

یہ کہہ کر ایاس نے اُن کے لنچ بکسوں میں سے ایک سینڈوچ نکالا' پھر اپنے دواؤں والے ڈبّے میں سے ایک چھوٹا سا بٹن نکال کر اُسے سینڈوچ میں رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ سینڈوچ رُونی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "اس سینڈوچ کو اپنی جیکٹ کی جیب میں احتیاط سے رکھنا۔ اگر تمہارا سامنا قراس سے ہو جائے تو اس سینڈوچ کو خوب زور سے دبانا۔ اس سے یہ بٹن چالُو ہو جائے گا اور اُس سے لہروں کی صورت میں ہلکی سی "پیں پیں" کا ایک سگنل نکلے گا جو مجھ تک پہنچ جائے گا اور میں فوراً تمہاری مدد کے لیے پہنچ جاؤں گا"۔

رُونی اور میکی کو حیران ہوتا دیکھ کر ایاس نے کہا "دیکھو' میں اس بٹن کو سینڈوچ میں اس لیے چھپا رہا ہوں کہ اگر قراس بے خبری میں تمہیں آلے تو اُسے سینڈوچ میں اس بٹن کا گمان تک نہیں ہو گا... مگر میری ایک بات ہر حال میں اپنے ذہن میں رکھنا۔ قراس جسمانی لحاظ سے ایک دیو سے کم نہیں ہے۔ تم تو دو ہو۔ اگر سو پچاس آدمی بھی ہوں تو وہ بھی اُس کو قابو میں نہیں کر سکتے"۔

رُونی اور میکی نے ایاس کا شکریہ ادا کیا اور پھر اُسے خدا حافظ کہہ کر غار سے باہر نکل آئے۔ جب وہ چلتے چلتے واپس پگ ڈنڈی پر پہنچے تو اُن کے قدم خود بخود رُک گئے اور وہ حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"کیا خیال ہے' رُونی؟" میکی نے رُونی کا کندھا زور سے دباتے ہوئے کہا "ہم یہاں سے سیدھے گھر واپس نہ چلے چلیں؟ وہاں سے مونٹی کو ساتھ لے کر آجائیں گے"۔

رُونی نے میکی کی بات پر غور کیا' پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا "نہیں' میکی۔ ہمارے لیے یہ مُمکن نہ ہو گا کہ یہاں سے گھر جائیں اور مونٹی یا دو چار اور لوگوں کو ساتھ لے کر جلد واپس آجائیں۔ پھر یہ بھی یاد رکھو کہ ایاس نے کیا کہا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ قراس پر قابو پانا کسی انسان کے بس کی بات نہیں"۔

یہ کہہ کر اُس نے پگ ڈنڈی پر چلنا شروع کر دیا اور کہا "آؤ' اپنی منزل کی طرف چلیں۔ ہمیں صرف یہ دُعا کرنی چاہیے کہ ہمارا سامنا قراس سے نہ ہونے پائے۔ آؤ' ذرا جلدی قدم بڑھاؤ"۔

باہر صبح کی تر و تازہ ہوا اپنے پھیپھڑوں میں بھر کے اُن کے چہروں پر تازگی آگئی تھی۔ وہ چلتے چلتے دائیں بائیں درختوں اور جھاڑیوں میں جھانکنے لگتے جیسے اُنھیں توقع ہو کہ قراس ان درختوں یا جھاڑیوں میں کہیں چھپا بیٹھا ہو گا۔

"وہ رہا کیبن!" رُونی نے دُور درختوں کے درمیان بنے ہوئے لکڑی کے کیبن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اُنھیں چلتے چلتے تقریباً ایک گھنٹا ہو گیا تھا اور اگرچہ دن کافی نکل آیا تھا مگر دُھند پُورے طور پر غائب نہیں ہوئی تھی' لیکن اس دُھند میں بھی وہ کیبن خاصا نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔

"میرا خیال ہے ہمیں کیبن کے اندر جانے کی بجائے اُس کے قریب جھاڑیوں کے جُھنڈ میں چھُپ کر پہلے اُس کا

اچھی طرح جائزہ لے لینا چاہیئے" میکی نے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے" رُونی نے کہا "ہمیں یہ اِطمینان کر لینا چاہیئے کہ کیبن کے اندر کوئی ہے تو نہیں۔ اِس کے بعد ہی اندر جانا مُناسب ہو گا"۔

وہ کیبن سے کچھ فاصلے پر ایک گھنی جھاڑی کی طرف بڑھے اور اُس کے پیچھے دبک کر کیبن کی طرف غور سے دیکھنے لگے۔

اُن کے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے اور کیبن کی طرف مُسلسل گھورتے رہنے سے آنکھوں میں جلن سی ہونے لگی تھی۔ کچھ دیر وہ اِسی طرح کیبن پر نظریں جمائے رہے اور جب اُنہیں اُس کے اندر کسی کی موجودگی کے آثار دکھائی نہ دیے تو اُنہوں نے اُس کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کیا۔

جیسے ہی وہ جھاڑی کی اوٹ سے نکل کر کیبن کی طرف بڑھے، رُونی نے میکی کا ہاتھ دباتے ہوئے اُسے رُکنے کا اِشارہ کیا۔ اُسے کیبن کے اندر سے لکڑی کے کسی تختے کے چرچرانے کی آواز سُنائی دی تھی۔ مگر اِس سے پہلے کہ وہ میکی کو چُپ رہنے کا اِشارہ کرتا، میکی نے خاصی اُونچی آواز میں کہا: "قراس تو شاید آبادی کی طرف نِکل گیا ہو گا اور....."

رُونی نے ایک دم میکی کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا اور سرگوشی میں کہا "خاموش رہو!"

مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ہونے والا نُقصان ہو کر رہا۔ میکی کی آواز اگرچہ اِتنی اُونچی نہیں تھی مگر فضا کی خاموشی نے اُسے کیبن کے اندر پہنچا دیا تھا۔ کیبن کے اندر سے ایاس ہی کی طرح کا کوئی وجُود بجلی کی سی تیزی سے باہر نکلا اور بجلی ہی کی تیزی سے اُس نے رُونی اور میکی کی کلائیوں کو اپنے فولادی شکنجے میں جکڑ لیا۔

لڑکے اِس اچانک حملے سے بدحواس ہو گئے اور خوف سے اُن کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اُن کی کلائیاں اِس خوف

تاک وجود کی فولادی گرفت میں نہ ہوتیں تو شاید وہ زمین پر گر کر بے ہوش ہو جاتے۔

"قراس!" وہ وجود غصّے سے گرجا "تمہیں کیسے پتا چلا میرے نام کا؟ بتاؤ؟ کون ہو تم؟ بتاؤ؟"

رونی اور میکی کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں۔ قراس کی انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی آنکھوں نے اُن پر خوف اور دہشت طاری کر دی تھی۔ اگرچہ اُن کے سامنے کھڑا ہوا قراس ایاس سے کچھ زیادہ مُختلف نہ تھا، مگر اُس میں وہ نرمی، شفقت اور محبّت نام کو بھی نہ تھی جو اُنہوں نے ایاس کے رَوَیّے میں دیکھی تھی۔

قراس کے فولادی شکنجے میں جکڑے ہوئے اُنہیں خیال آیا کہ ایاس نے اُس کے مُتعلّق جو کچھ کہا تھا، وہ دُرست تھا۔ اُس نے صحیح کہا تھا کہ قراس پر قابو پانا کسی اِنسان کے بس کی بات نہیں۔ اِس عرصے میں رُونی نے اپنے خوف پر کچھ قابو پالیا تھا۔ اُس نے حوصلہ کر کے کہا "ہاں---- ہم---- جانتے------ ہیں کہ تم کون ہو"۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کسی طرح اُس کا ایک ہاتھ آزاد ہو جائے تاکہ وہ سینڈوِچ میں چھپے ہوئے بٹن کو چالُو کر سکے۔

"اچّھا" قراس نے غصّے سے غُراتے ہوئے کہا "تو یہ بات ہے۔ اِس کا مطلب ہے کہ تم ایاس سے مِل چکے ہو۔ اور اُس نے تمہیں میرا نام بتایا ہے۔ شاید نام کے عِلاوہ اور کچھ بھی بتایا ہو"۔

پھر وہ اُن دونوں کو جھنجھوڑتے ہوئے کہنے لگا "کہاں ہے وہ اِس وقت؟ بتاؤ! جلدی بتاؤ!"

"اوہ! اوہ!" میکی اور رُونی درد سے چیخنے لگے۔ اُن کی کلائیاں دُکھنے لگی تھیں، اُن کی پیٹھوں سے بندھے ہوئے تھیلے کُھل کر زمین پر گر گئے تھے اور اُن میں رکھی ہوئی چیزیں اِدھر اُدھر بکھر گئی تھیں۔

"ہُوں!" قراس نے غصّے سے کہا "تو اُس نے تمہیں میری جاسوسی کرنے کے لیے یہاں بھیجا ہے۔ پہلے تو میں تمہاری اور تمہاری چیزوں کی اچھی طرح تلاشی لیتا ہُوں تاکہ مجھے اِطمینان ہو جائے کہ اُن میں ایاس نے جاسوسی کے آلات تو نہیں چُھپا رکھے ہیں۔ وہ بڑا چالاک ہے!---- بڑا چالاک----"!

یہ کہ کر اُس نے اُن کی جیکٹوں کی تلاشی لی۔ جب اُس نے رونی کی جیب سے بٹن والا سینڈوِچ نکالا تو رونی کا دل اُچھل کر اُس کے حلق میں آگیا۔ مگر پھر جو کچھ ہُوا، وہ رونی کے وہم و گُمان میں بھی نہ تھا۔ قراس نے ایک زور دار قہقہہ لگاتے ہوئے سینڈوِچ واپس رونی کے ہاتھ میں تھما دیا اور کہا:

"بڑے پیٹُو ہو تُم۔ اُدھر تھیلوں میں کھانے پینے کا اِتنا سامان بھر رکھا ہے اور اِدھر جیبوں میں بھی سینڈوِچ ڈالے پھرتے ہو۔ لو، رکھو اِسے اپنے پاس"۔

رونی کی جان میں جان آگئی۔ اُس نے سینڈوِچ کو جتنے زور سے دبایا جا سکتا تھا، دبایا اور پھر اُسے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اسے پوری توقّع تھی کہ سینڈوِچ میں چُھپا ہوا بٹن چالُو ہوگیا ہوگا اور اُس سے نکلنے والا سگنل ایاس تک پہنچ جائے گا۔ قراس نے اُن کی جیبوں کی تلاشی لینے کے بعد سامان کو بھی خوب اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ اُس نے چھتری اور ٹارچ کو بھی نہیں چھوڑا اور اُنہیں کھول کر اُن کا غور سے مُعاینہ کیا۔ جب اُسے اُن کے سامان میں کوئی مشکوک چیز نظر نہ آئی تو اُسے اِطمینان ہوگیا اور وہ کہنے لگا "معلوم ہوتا ہے ایاس کو تُم سے کسی خاص مدد کی توقّع نہیں تھی۔ پھر بھی مجھے اِحتیاط سے کام لینا ہوگا"۔

یہ کہ کر اُس نے رونی کے بازو جکڑ لیے اور میکی کو پرے دھکیلتے ہوئے کہنے لگا "میں اِس پیٹُو کو اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں۔ اگر اِس نے شرافت دکھائی تو میں اپنا منصُوبہ مکمّل ہو جانے کے بعد اِسے چھوڑ دوں گا"۔

میکی قراس کے دھکّا دینے سے لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گرا تو قراس نے اُس سے کہا "تُم اپنے اِس دوست کے

واپس آنے تک یہیں رہو گے اور اِدھر اُدھر کہیں نہیں جاؤ گے۔ اگر مجھے پتا چل گیا کہ تم نے میرے بارے میں ایاس کو اِطّلاع دی ہے تو میں تمہارے اِس دوست کو جان سے مار ڈالوں گا"۔

"نہیں" رونی نے اپنے آپ کو اُس کی گِرفت سے چھُڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا "تم ایسا نہیں کر سکتے۔ نہیں کر سکتے"۔

"چل، میرے ساتھ!" قراس نے رُونی کو گھسیٹتے ہوئے کہا "مجھے یقین ہے کہ ایاس سیدھا خلائی جہاز کی طرف جائے گا۔ جلدی چلو۔ میں اُس کے پہنچنے سے پہلے وہاں پہنچ جانا چاہتا ہوں"۔

رونی نے محسوس کر لیا تھا کہ قراس کا مُقابلہ کرنا بے کار ہے۔ چُناں چہ وہ خاموشی سے اُس کے ساتھ چل دیا۔ اُس کے دل کو جو ڈھارس تھی تو صرف اِس خیال سے کہ سینڈوِچ کے دبانے سے اُس کے اندر چُھپا ہُوا بٹن چالُو ہو گیا ہو گا اور اِس طرح ایاس کو اُس کا اور میکی کا سُراغ لگانے میں مدد مِل سکے گی۔ (باقی اگلے مہینے)۔

دُنیا کا سب سے چھوٹا ملک کہاں ہے؟

دُنیا کا سب سے چھوٹا ملک ویٹی کن سٹی (Vatican City) ہے۔ یہ شہر اِٹلی کے دارُالحکُومت روم کی حدود میں، دریائے ٹائبر کے مغربی کنارے پر آباد ہے۔ اِس کا رقبہ 108 ایکڑ اور آبادی صرف 1000 ہے۔

ویٹی کن سٹی میں عیسائیوں کے رومن کیتھولک فِرقے کا سب سے بڑا پیشوا، پوپ، رہتا ہے، اور وہی اِس ملک کا سب سے بڑا حاکِم ہے۔ یہ شہر ہمیشہ سے رومن کیتھولک فِرقے کا رُوحانی و اِنتظامی مرکز رہا ہے۔ 1929ء میں اِسے ایک آزاد و خود مُختار ملک بنا دیا گیا۔

اِس ننھے مُنّے ملک کا اپنا ریلوے اِسٹیشن، اپنا بینک، اپنا بجلی گھر، اپنا ریڈیو اِسٹیشن، اپنا سِکّہ، اپنا ڈاک کا نِظام اور اپنی چھوٹی سی پولیس ہے۔ یہاں سے ایک روزانہ اخبار بھی شائع ہوتا ہے جس میں زیادہ تر پوپ اور مُختلف ملکوں کے گِرجا گھروں کی سرگرمیوں کے بارے میں خبریں ہوتی ہیں۔

ویٹی کن سٹی میں داخل ہونے کے لِیے کسی پاسپورٹ کی ضرورت نہیں۔ ہر سال لاکھوں لوگ، دُنیا کے کونے کونے سے، یہاں آتے ہیں۔ یہاں کے گِرجا گھر، سینٹ پیٹر کا چوک، پوپ کا مَحل، عجائب گھر، لائبریری اور خوب صورت باغ دیکھنے کی چیز ہیں۔ سستائن گرجا کی دیواروں اور چھت پر مشہور آرٹسٹ مائیکل اینجیلو کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھنے والوں کو حیرت زدہ کر دیتی ہیں۔ (س۔ل)۔

oooooooooooooooo

سعید لخت

ٹھواں

چھٹی کا دن تھا اور صبح کا وقت۔ میں، شمیم آپا اور ریحان ٹی وی پر جنگلی جانوروں کی فلم دیکھ رہے تھے کہ ہماری نوکرانی، ماسی، بھاگی بھاگی آئی۔ اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ بولی "چھوٹے صاحب جی، بی بی جی-----"

"کیا ہوا؟ قیامت آگئی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جی، قیامت نہیں---- ٹھواں!" ماسی بولی۔

میں نے شمیم آپا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا "ٹھواں؟ ٹھواں کیا؟"

"ٹھواں؟" شمیم آپا سوچتے ہوئے بولیں "یہ شاید دھواں کہہ رہی ہے"۔

"او جی، بی بی جی، دھواں نہیں، ٹھواں" ماسی نے کہا "چل کر دیکھیں۔ دیوار پر بیٹھا ہے"۔

"چلو، بھئی۔ دیکھتے ہیں" شمیم آپا بولیں اور ہم تینوں اُٹھ کر ماسی کے ساتھ باہر گئے۔ باہر، لان کی بائیں دیوار پر، زمین سے کوئی دو فٹ اُوپر، ایک بچھو چمٹا ہوا تھا۔

"ارے، ماسی، یہ تو بچھو ہے" میں نے کہا۔

"او مائی گاڈ!" شمیم آپا بولیں "It is a Scorpion." شمیم آپا کو انگریزی بولنے کا بہت شوق ہے۔

"جاؤ، ریحان۔ ڈیڈی کو بلا کر لاؤ" میں نے کہا۔

ریحان کے جانے کے بعد میں نے ذرا قریب سے بچھو کا معاینہ کیا۔ وہ دو انچ کے قریب لمبا اور مٹیالے رنگ کا تھا۔ اُس کی آٹھ ٹانگیں تھیں اور سر کے دونوں طرف دو بازو تھے، جن کے سرے پر پنجے تھے۔ جسم کے پیچھے اُوپر کو اُٹھی ہوئی دُم تھی جو بل کھا کر پیٹھ پر آگئی تھی۔ اِس دُم کے سرے پر ایک مُڑا ہوا، نوکیلا ڈنک تھا جو سوئی کی طرح چمک رہا تھا۔ اُس کا پیٹ غبارے کی طرح کبھی پھولتا اور کبھی پچک جاتا۔

اُسی وقت ریحان کی آواز سنائی دی "یہ دیکھیے، ڈیڈی۔ دیوار سے چمٹا ہوا ہے۔ ماسی اِسے ٹھواں کہہ رہی تھی، اور بھائی جان نے بچھو کہا"۔

"اچھا بھئی، اچھا" ڈیڈی بولے "بچھو اور ٹھواں ایک ہی بات ہے۔ اِسے چھونا مت۔ اِس کے ڈنک میں زہر ہوتا ہے"۔

"اِس کی آٹھ ٹانگیں ہیں" میں نے کہا "کیا یہ مکڑی کی کوئی قسم ہے؟"

ڈیڈی بولے "مکڑی کی قسم تو نہیں، البتّہ اُس کا رشتے دار ضرور ہے"۔ اِتنے میں بچھو نے اپنے پنجے ہلائے، جیسے کسی چیز کو پکڑنا چاہتا ہو۔

"یہ تو کیکڑے کی طرح ہے" ریحان نے کہا۔

"کیکڑا کیا؟" شمیم آپا نے پُوچھا۔

"Crab" ڈیڈی نے بتایا "قدیم زمانے میں بچھو اور کیکڑے ایک ہی خاندان کے جانور تھے۔ بچھو دُنیا کا قدیم ترین جانور ہے اور 40 کروڑ سال سے زمین پر رہ رہا ہے۔ آپ کو یہ سُن کر تعجّب ہوگا کہ اِس عرصے میں دوسرے جانوروں میں کافی تبدیلی آئی ہے، لیکن بچھو ویسا کا ویسا ہی ہے جیسا 40 کروڑ سال پہلے تھا۔ سائنس دان اِسے زندہ فاسل کہتے ہیں"۔

"یہ کھاتا کیا ہے؟" ریحان نے پُوچھا۔

"مکڑیاں اور کیڑے مکوڑے" ڈیڈی نے کہا "رات کو شکار کرتا ہے اور اُسے زندہ نگل جاتا ہے۔ اگر کوئی شکار اِس کے پنجوں سے نکلنے کی کوشش کرے تو یہ اُس کے ڈنک مار دیتا ہے، جس سے وہ مرجاتا ہے اور پھر یہ اُسے کھاجاتا ہے"۔

"کیا اِس کے ڈنک سے آدمی بھی مر سکتا ہے؟" ریحان نے پُوچھا۔

ڈیڈی نے کہا "مرتا تو نہیں لیکن اُسے تکلیف بہت ہوتی ہے۔ بچپن میں ایک بچھو نے میرے ڈنک مار دیا تھا۔ میں دو دِن مچھلی کی طرح تڑپا تھا۔ شمالی امریکا کے ایک مُلک، میکسیکو، میں بہت خطرناک بچھو پائے جاتے ہیں۔ اُن کے کاٹے سے اِنسان مرجاتا ہے"۔

"اگر بچھو رات کو شکار کرتے ہیں تو کیا دن میں سوتے

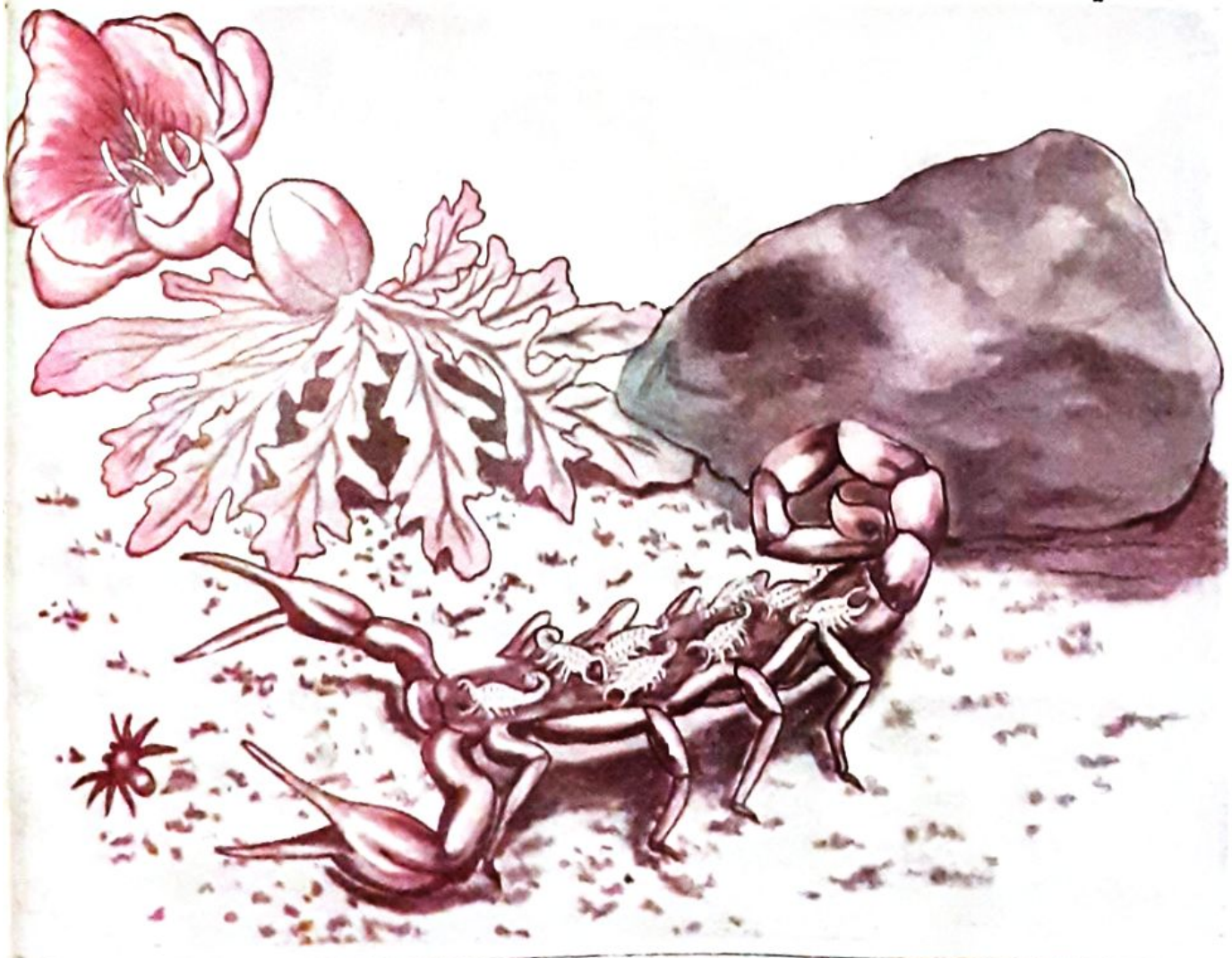

ہیں؟" میں نے پُوچھا۔

"ہاں' یہ دِن میں پتھّروں' اِینٹوں کے نیچے اور سُوراخوں کے اندر چھُپ کر سوئے رہتے ہیں اور رات کو باہر نکلتے ہیں۔ یہ زیادہ دُھوپ برداشت نہیں کر سکتے۔ اِنہیں سایہ چاہیئے۔ دُھوپ میں مرجاتے ہیں"۔

"بچھّو کی مادہ انڈے دیتی ہے؟" ریحان نے پُوچھا۔

"نہیں' بچّے دیتی ہے" ڈیڈی نے کہا "اور یہ بچّے جب تک خود چلنے پھرنے اور شکار کرنے کے قابل نہیں ہو جاتے' ماں کی پیٹھ پر چڑھے بیٹھے رہتے ہیں"۔

جب ڈیڈی ہمیں یہ باتیں بتا رہے تھے' میں بچّھو کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ تھوڑی دُور چلتا اور پھر رُک جاتا۔ پھر چلتا اور پھر رُک جاتا۔

"بچھّو کے دُشمن بھی تو ہوں گے؟" میں نے ڈیڈی سے پُوچھا۔

"ہاں۔ اِن کے بہُت سے دُشمن ہیں' مثلاً پرندے' چھپکلیاں' بندر۔ یہ جانور بچھّو بہُت شوق سے کھاتے ہیں--- اب سوال یہ ہے کہ ہم اِس کا کیا کریں؟"

"میں بتاتی ہُوں' کیا کریں" یہ امّی کی آواز تھی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اُنہوں نے جُوتی اُتاری اور تڑاق سے بچھّو کے دے ماری۔ اُس کا کچُومر نکل گیا۔

ڈیڈی بولے "آپ نے خواہ مخواہ اِس بے چارے کو مار ڈالا"۔

امّی بولیں "یہ بے چارہ نہیں' بہُت مُوذی جانور ہے' اور مُوذی کو دیکھتے ہی ہلاک کر دینا چاہیئے"۔

"ہماری امّی بہُت بہادر ہیں" ریحان نے کہا۔

"آپ کی امّی خوش حال خان خٹک کے خاندان سے ہیں" ڈیڈی نے کہا۔

امّی ہنس کر بولیں "ہمارے ہاں پشاور کے علاقے میں بچھّو بہُت ہوتے ہیں۔ جب میں وہاں تھی تو روز دو تین بچھّو مارا کرتی تھی"۔

ہم تینوں بہن بھائی بچھّو کو' بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اُس کے کچُومر کو افسوس بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ ڈیڈی بولے "میں نے آپ کو بچھّو کے کتنے دُشمن بتائے تھے؟"

"تین: پرندے' چھپکلیاں اور بندر" میں نے بتایا۔

"اِن میں اِنسان کا اِضافہ بھی کر لیں" ڈیڈی نے کہا۔

آپ جانتے ہیں؟

☆ عربی زبان میں اُونٹ کے لیے تقریباً 100 مُختلف الفاظ اِستعمال ہوتے ہیں۔

☆ 72 سال کی عُمر تک ایک آدمی کا دِل 3,000 ملین (تین ارب) دفعہ دھڑک چُکا ہوتا ہے۔

☆ ہم ناک سے سُونگھتے ہیں۔ سانپ زبان سے سُونگھتے ہیں۔

☆ اصلی ہیرا ٹھنڈا ہوتا ہے۔ آپ اُسے چُھو کر بتا سکتے ہیں کہ وہ اصلی ہے یا نقلی۔

☆ انگریزی کے اِس جُملے میں انگلش کے تمام (26) حروف موجود ہیں:

The quick brown fox jumps over the lazy dog.

☆ آدمی کے ڈاڑھی کے بال اِتنی ہی موٹائی کے تانبے کے تاروں سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔

☆ اگر آپ 6 میل فی گھنٹے کی رفتار سے' بغیر رُکے' سیدھے بھاگتے چلے جائیں تو 173 دن میں پُوری دُنیا کا چکّر لگا سکتے ہیں۔

☆ دنیا میں 900 کے قریب چڑیا گھر ہیں۔ اِن میں' جانوروں کی تعداد کے لحاظ سے' سب سے بڑا سان ڈیگو کا چڑیا گھر ہے۔ (سان ڈیگو ریاست ہائے مُتحدہ امریکا کی ایک ریاست کیلی فورنیا کا دوسرا بڑا شہر ہے)۔ یہ چڑیا گھر 78 سال پُرانا ہے اور اس میں 800 قسم کے 3,800 جانور ہیں۔

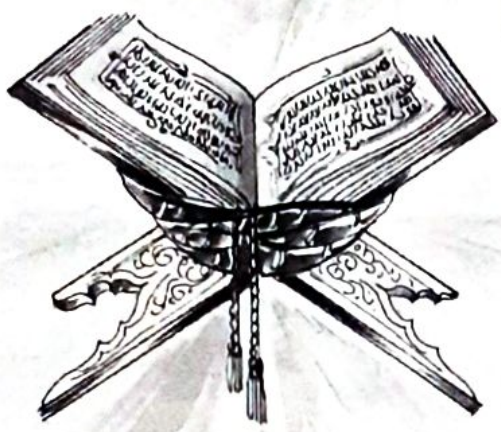

درسِ قرآن

سیدھا راستہ

بچّوں کے لیے درسِ قرآن میں ہمارا آج کا موضوع ہے: سیدھا راستہ۔

موضوع کی تشریح کے لیے ہم نے قرآنِ عزیز کی پہلی سورت الفاتحہ کی پانچویں آیت چُنی ہے، جو یوں ہے:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ

ترجمہ: ہمیں سیدھی راہ دکھا۔

یہ ایک بنیادی دعا ہے جو ہر مسلمان کے دل کی آرزو بھی ہے۔ سورہ فاتحہ ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔ اِس سے بھی اِس عظیم دُعا کی اہمیّت واضح ہے۔

مسلمان زندگی کے ہر شعبے میں سیدھے راستے کا خواہاں ہوتا ہے۔ وہ خود بھی سیدھے راستے پر چلتا ہے اور دوسروں کو بھی سیدھی راہوں پر چلنے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔ سیدھی راہوں پر چلنے والے ہمیشہ پھلتے پھولتے ہیں اور ٹیڑھی راہوں والے ہمیشہ نقصان اُٹھاتے ہیں۔

ہمیں اپنی روزمرّہ زندگی پر غور و فکر کرنا چاہئے اور سوچنا چاہئے کہ کیا ہم واقعی سیدھے راستے پر چل رہے ہیں یا اس سے ہٹتے جا رہے ہیں؟ گھر میں ہر ایک سے اُلجھنا، گندہ اور غلیظ رہنا، مدرسے میں ساتھیوں سے لڑنا بھڑنا، سبق اچھّی طرح نہ پڑھنا، امتحان میں گڑبڑ کرنا، گلی بازار میں گالی گلوچ، نماز سے جی چُرانا، کھیل کود میں حصّہ نہ لینا وغیرہ یہ سب سیدھے اور اچھّے راستے سے ہٹنے کی چند عام مثالیں ہیں۔ اِن سے بچنا بہت ضروری ہے۔

ہر اچھّے بچّے کو اُلٹی راہوں سے بچنے اور سیدھی راہوں پر چلنے کی باقاعدگی سے دعا مانگنی چاہئے۔ دعا کے ساتھ ساتھ اس بات کی عملی کوشش بھی ہونی چاہئے کہ ہر بات اور ہر کام میں سیدھا راستہ ہی اختیار کیا جائے۔ ایسے صحّت مند رویّے سے زندگی کے ہر معاملے میں کامیابی اور خوشی یقینی ہے۔

ڈاکٹر عبدالرؤف

سنہری چڑیا نے کہا:

جو اپنے لیے چاہو
وہی
دوسروں کے لیے چاہو

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

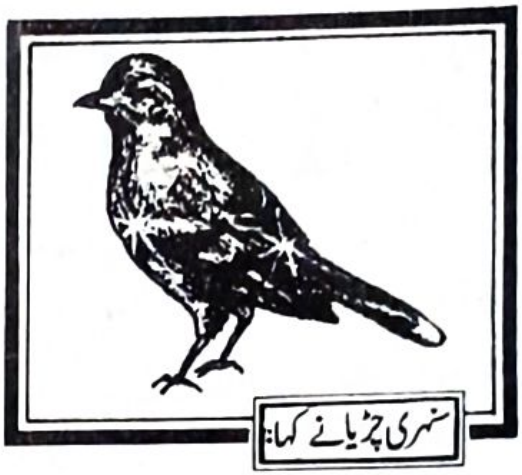

پیارے بچّو، قدیم زمانے میں ہندوستان بہت سی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر ریاست پر ایک راجا حکومت کرتا تھا۔ آج میں آپ کو ایک خود غرض راجا کی کہانی سنانا چاہتی ہوں۔ اس کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہمیں خود غرض نہیں ہونا چاہیے، بلکہ ہم جو اپنے لیے چاہتے ہیں، وہی ہمیں دوسروں کے لیے بھی چاہنا چاہیے۔ اس سے دوسروں کا بھی بھلا ہوتا ہے اور اپنا بھی۔ کسی بُزرگ کا یہ قول جتنا مشہور ہے، اُتنا ہی سچّا بھی ہے:

کر بھلا ہو بھلا، انت بھلے کا بھلا

ایک تھا راجا۔ اس کی رِعایا تو اچّھی تھی، لیکن راجا کو لوگوں کے حال کی پروا نہ تھی۔ ریاست میں سرکاری اسکول تھے نہ ہسپتال۔ آبادی زیادہ تر اَن پڑھ تھی۔ لوگ جاہل اور بُت پرست تھے۔ راجا اور پنڈتوں کو سجدہ کرنے کا دستور تھا۔

اس زمانے میں طاعون ایسے موذی اور جان لیوا مرض کا کوئی علاج نہ تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ اس خود غرض راجا کی راج دھانی (دارُالحکومت) میں طاعون کا مرض پھیل گیا۔ راجا سخت گھبرایا۔ اس نے خوشامدی درباریوں کے مشورے سے محل کی دیواریں اونچی کرلیں تاکہ شاہی خاندان اس موذی مرض سے محفوظ ہو جائے۔

لیکن اس نے رِعایا کو اس موذی مرض سے بچانے کے لیے کچھ بندوبست نہ کیا۔ یہ خود غرضی اس کو بڑی مہنگی پڑی۔ وہ اگر رعایا کا بھلا سوچتا تو اس کا بھی بھلا ہوتا۔ اس نے رعایا کو طاعون کے حوالے کر دیا تو قدرت نے اس کے اکلوتے بیٹے، راج کمار، کو طاعون میں مُبتلا کر دیا۔

راجا اپنے محل کی دیواریں اونچی کر کے مطمئن ہو گیا تھا اور شکار کھیلنے کے لیے دور چلا گیا تھا۔ کئی دنوں تک وہ اپنے درباریوں کے ساتھ شکار کھیلتا رہا۔ جب واپس آیا اور محل میں داخل ہوا تو عورتوں کے رونے اور واویلا کرنے کا شور سن کر اس کا کلیجا مُنہ کو آنے لگا۔ پوچھا تو ملازموں نے روتے ہوئے اسے بتایا کہ "راج کمار طاعون سے مر گیا ہے۔ یہ سنتے ہی راجا گھوڑے سے گرا اور مر گیا۔

سنہری چڑیا بولی: پیارے بچّو، کہانی یہاں ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ آگے چلتی ہے۔ لو سنو:

اُن دنوں ہندوؤں میں "ستی" کا رواج تھا۔ جب کسی عورت کا شوہر مرجاتا تو اس عورت کو شوہر کے ساتھ زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ برہمنوں نے ستی کو ہندو دھرم کا ضروری رُکن قرار دیا ہوا تھا۔ چُناں چہ خود غرض راجا کی بیوی کو بھی برہمنوں نے راجا کے ساتھ جل مرنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے بیوہ مہارانی کو چِتا کے قریب لے جاکر اس کی آنکھوں پر سیاہ پٹّی باندھی اور پھر گھی کا کنستر اس پر ڈال دیا اور وہ گھی میں تربتر ہو گئی تو ایک موٹے تگڑے پُجاری نے اسے اٹھا کر چِتا میں پھینک دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھی راجا کے ساتھ جل کر راکھ ہو گئی۔

اب اس راجا کے ملک کا کوئی والی وارث نہ تھا۔ یہ دیکھ کر ہمسایہ راجا نے اس پر حملہ کر کے راجدھانی پر قبضہ کرلیا۔ اس راجا کا نام سورج داس تھا۔ وہ خود غرض نہ تھا' بلکہ فیّاض اور سخی تھا۔ اس نے آدھی دولت غریب رعایا میں بانٹ دی۔ باقی دولت سے اس نے راجدھانی میں ہسپتال بنوائے اور بچّوں کی تعلیم و تربیت کا مناسب انتظام کیا۔ اس طرح رعایا کے دلوں کو موہ لیا۔

طاعون کا مرض چوہوں سے پھیلتا ہے۔ اس نے طاعون کو روکنے کے لیے رعایا کو چوہے مارنے کا حکم دیا اور ایک چوہے کو مارنے کا مُعاوضہ ایک سکّہ دینے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح چند ماہ میں چوہوں کا خاتمہ ہوگیا اور رعایا طاعون کے موذی مرض سے محفوظ ہوگئی۔ سورج داس کی حکومت میں زراعت اور تجارت نے حیرت انگیز ترقّی کی۔ اس نے مرنے والے راجا کی جاگیروں کو کسانوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ جس سے ریاست کی زرعی پیداوار میں بہت زیادہ اِضافہ ہوگیا۔ اس کے نتیجے میں رعایا خوش حال ہوگئی اور لوگ اپنے اِس نئے راجا پر جان دینے لگے۔

اس ریاست کے ہمسائے میں ایک اور ریاست تھی۔ اس کے راجا کا نام گنگا رام تھا۔ وہ خود غرض' لالچی اور خوشامد پسند تھا۔ خوشامدی درباریوں نے اس سے کہا کہ راجا سورج داس کے خزانوں میں بے شمار دولت ہے۔ اگر راجا اس پر حملہ کر دے تو اس کی ساری دولت اس کے ہاتھ آ سکتی ہے۔

راجا گنگا رام نے یہ سنا تو اس کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے اپنے سیناپتی (سپہ سالار) کو حکم دیا کہ وہ فوراً حملے کی تیّاری شروع کرے۔ سیناپتی نے راجا کے حکم کی تعمیل کی اور ایک ہفتے کے اندر راجا فوج لے کر سورج داس کی ریاست پر چڑھ دوڑا۔

جاسوسوں نے راجا سورج داس کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ راجا گنگا رام حملہ کرنے والا ہے۔ چناں چہ اس نے بھی اپنی فوج کو تیّار رہنے کا حکم دے دیا۔ پھر اپنے سیناپتی کے ہمراہ اس نے میدان جنگ کا معاینہ کیا اور مناسب مقام پر فوج کو مورچے سنبھالنے کا حکم دیا اور حملہ آور لشکر کا انتظار کرنے لگا۔

راجا گنگا رام کا منصوبہ یہ تھا کہ راجا سورج داس پر اچانک حملہ کر کے اس کی راجدھانی پر قبضہ کرلے۔ لیکن سورج داس کے لشکر کو مقابلے کے لیے تیّار دیکھا تو حیران رہ گیا۔ بہرحال' لڑائی شروع ہوگئی اور بڑے زور کا رن پڑا۔

صبح سے سہ پہر تک فوجیں لڑتے لڑتے تھک گئیں تو راجا سورج داس نے اپنے جنگی منصوبے کے مطابق سیناپتی کو حکم دیا کہ وہ تربیت یافتہ ہاتھیوں کے دستے کے ساتھ دشمن کے لشکر پر بائیں جانب سے حملہ کر دے۔ سیناپتی نے ایسا ہی کیا۔ ہاتھیوں کے اچانک حملے سے گنگا رام کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ یہ دیکھ کر گنگا رام بھاگ اٹھا۔ اس کے بہت سے فوجی مارے گئے اور بہت سے پکڑے گئے۔

اس فتح کی خوشی میں راجا سورج داس کی رِعایا نے کئی روز تک جشن منایا۔ راجا نے فوجی افسروں کو اِنعامات سے نوازا اور غریبوں کو مالی امداد دی۔

سورج داس نے اپنی رعایا کی بڑی خدمت کی۔ اس نے ملک میں جگہ جگہ اسکول کھولے جن میں طالب علموں کو مفت تعلیم دی جاتی تھی' اور ان کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا انتظام بھی کیا۔ ہسپتال بھی بنوائے' جن میں علاج معالجے کا مفت انتظام تھا۔ اس نے اپنی راجدھانی میں پکّی سڑکوں کا جال بچھا دیا' غریبوں کے لیے لنگر خانے بنائے' جن میں غریبوں کو مفت کھانا ملتا۔ مسافروں کے لیے سرائیں بنوائیں' پُل اور تالاب بنوائے۔ مظلوموں کو مفت اور فوری انصاف دینے کی خاطر جا بجا عدالتیں قائم کیں۔ سچ ہے!

اچّھوں کا ذکر بھی اچّھا ہی ہوتا ہے

ذرا سی غلطی

محمد فاروق انجم

ایک درجن کیلے ریڑھی والے نے شاپنگ بیگ میں ڈال کر اسد کے حوالے کیے تھے اور اب وہ کیلوں والا بیگ لہراتا اپنے دوست حسن کے ساتھ گھر کی طرف جا رہا تھا۔ حسن ایک دوسرے محلّے میں رہتا تھا۔ اور تقریباً ڈیڑھ ہفتے بعد اسد سے ملنے آیا تھا۔ اسد اُس سے مِل کر بہت خوش تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔ اِس دوران میں اُنہوں نے چائے بھی پی اور کیلے بھی کھائے۔ پھر حسن اسد سے اِجازت لے کر چلا گیا۔ اسد نے کیلے کے چھلکے اُسی شاپنگ بیگ میں ڈالے، دروازہ کھول کر شاپنگ بیگ گھُما کر گلی میں پھینکا اور دروازہ بند کر لیا۔

چھلکوں سے بھرا شاپنگ بیگ گٹر کے ڈھکّن کے پاس جا گرا تھا۔ گٹر کا ڈھکّن آدھا ٹوٹا ہُوا تھا۔ کسی راہ گیر کی ٹھوکر لگنے سے شاپنگ بیگ سیدھا گٹر میں جا گرا۔

شام ہُوئی اور پھر رات، اور پھر دوسرے دِن کا سُورج طلُوع ہو گیا۔ راتوں رات وہ شاپنگ بیگ گٹر میں سفر کرتا ہُوا پائپ کے مُنہ میں پھنس گیا۔ گٹر آہستہ آہستہ بھرتا گیا اور پھر اُبل پڑا اور سارا گندہ پانی گلی میں پھیل گیا۔

لوگ جب صبح گھروں سے باہر نکلے تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ پُوری گلی پانی سے بھری ہوئی ہے۔ چاروں طرف بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہر کوئی بُرا سا مُنہ بنا کر سوچ رہا تھا کہ یہ راتوں رات کیا ماجرا ہو گیا!

امجد میاں بڑے مزے سے سائیکل پر سوار اِسکول جانے کے لیے گلی میں نکلے تو پانی دیکھ کر چونک پڑے۔ ایک لمحے کے لیے اُنہوں نے سوچا کہ واپس مُڑ جائیں اور دوسری گلی سے چلے جائیں۔ مگر پھر سوچا کہ تھوڑا سا پانی ہے، آسانی سے گزر جائیں گے۔ چُناں چہ وہ آہستہ آہستہ سائیکل چلاتے ہوئے پانی میں اُتر گئے۔ ابھی زیادہ دُور نہیں گئے تھے کہ اُن کی سائیکل پھِسل گئی اور وہ دھڑام سے گندے پانی میں، سائیکل سمیت، گر پڑے۔ اُن کا سر ایک اینٹ سے ٹکرایا اور خون بہنے لگا۔ ساری کتابیں بھیگ گئیں۔

رِیاض صاحب اپنے دروازے میں کھڑے گلی کا جائزہ لے رہے تھے۔ اُنہوں نے امجد میاں کو گرتے دیکھا تو فوراً بھاگے تاکہ اُن کی مدد کر سکیں۔ لیکن ابھی وہ امجد میاں تک

پہنچ بھی نہ پائے تھے کہ اُن کے مُنہ سے "آہ" نکل گئی۔

رِیاض صاحِب ننگے پاؤں تھے۔ گندے پانی میں پڑی شیشے کی کِرچی نے اُن کا پیر زخمی کر دیا تھا۔ اُنھوں نے اپنا پیر پانی سے نکال کر دیکھا - شیشے کی کِرچی اُن کے پیر میں چُبھی ہُوئی تھی۔ اُنھوں نے اپنے پیر میں سے کِرچی نکالی تو اُس میں سے خون کا فوارہ پُھوٹ پڑا۔ مارے تکلیف کے ریاض صاحِب امجد میاں کو بھی بھول گئے۔

امجد میاں اِس دوران میں اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے اپنا زخمی سر پکڑ رکھا تھا۔ خون اُن کے چہرے اور گردن سے ہوتا ہُوا قمیص تک آگیا تھا۔ اِن دونوں کا یہ حال دیکھ کر جمشید صاحِب آگے بڑھے اور اُن کو سہارا دے کر خُشک جگہ پر لا کر بٹھایا۔ صبح کا وقت تھا۔ ابھی کسی ڈاکٹر نے کلینک نہیں کھولا تھا۔ چُناں چہ جمشید صاحِب اور چند

دوسرے لوگ اُنہیں اپنے تئیں اِبتدائی طبّی اِمداد دینے لگے۔

"یہ کیا ہوگیا؟" جمال صاحِب اپنے گھر سے نکل کر بولے۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ گٹر کیسے بند ہوگیا!" ایک اور صاحِب فِکر مندی سے بولے۔

"میری کتابیں؟" امجد میاں کو جیسے ہی ذرا ہوش آیا' اُنھوں نے حیرت زدہ نگاہوں سے اپنی کتابوں کی طرف دیکھا۔ اُن کی حالت ایسی خستہ ہوگئی تھی کہ اب نئی خریدنے سے ہی کام بن سکتا تھا "میرے نوٹس! سب کچھ ضائع ہوگیا"!

امجد میاں اِسکول جانے کی بجائے اپنے گھر واپس چلے گئے۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں اِسکول نہیں جا سکتے تھے۔ اُن کا ایک قیمتی دِن ضائع ہوگیا۔

رِیاض صاحِب کے لِیے دفتر جانا بہُت ضروری تھا۔ لیکن پیر میں گہرا زخم آنے کی وجہ سے اُن کو بھی چُھٹّی کرنا پڑی اور وہ بھی گھر جاکر بستر پر لیٹ گئے۔

رؤف صاحِب کو ایک شادی میں جانا تھا۔ وہ باہر گلی میں لوگوں کی آوازیں سُن کر دروازے پر آگئے تھے۔ گلی میں پانی کھڑا دیکھ کر بولے "پتا نہیں گٹر آئے دن کیوں بند ہو جاتے ہیں؟"

اسد بھی اپنے گھر سے باہر آگیا تھا۔ گلی میں دُور تک پھیلا ہوا پانی دیکھ کر اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ اُسے یاد آیا کہ کل شام اُس نے کیلے کھا کر جو شاپنگ بیگ پھینکا تھا' اُسی نے گٹر بند کر دیا ہے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دو منچلے لڑکے موٹر سائیکل پر تیزی سے پانی میں سے گزُرے تو گندے پانی کے چھینٹے اُڑ کر رؤف صاحِب کے سفید اور بے داغ کپڑوں پر پڑے۔ سارے کپڑوں کا ناس ہوگیا۔ اب وہ شادی میں کیسے جاتے؟

"بدتمیز!" انُھوں نے غصّے سے کہا۔

یہ فِقرہ سُنتے ہی موٹر سائیکل سوار واپس مُڑے اور رؤف صاحِب کے پاس موٹر سائیکل کھڑی کر کے نیچے اُترے۔ اُن میں سے ایک نے پُوچھا "آپ نے ہمیں بدتمیز کہا تھا؟"

"ہاں' میں نے کہا تھا" رؤف صاحِب تیزی سے بولے۔

"کیوں؟"

"دیکھ نہیں رہے کہ گلی میں پانی کھڑا ہے اور تُم موٹر سائیکل یُوں دوڑا رہے ہو گویا موت کے کُنویں میں موٹر سائیکل چلا رہے ہو"۔

رؤف صاحِب کا اِتنا کہنا تھا کہ ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ دونوں لڑکے رؤف صاحِب کے ساتھ گتھّم گتھّا ہوگئے۔ آخر محلّے والوں نے بڑی مُشکِل سے اُنہیں چُھڑایا۔

اسد نے ایک بار پھر گلی کا جائزہ لیا اور اب تک ہونے والے واقِعات پر غور کرنے لگا۔ وہ اِن واقِعات کا ذمّے دار اپنے آپ کو ٹھہرا رہا تھا۔ نہ وہ شاپنگ بیگ لاپروائی سے پھینکتا' نہ گٹر بند ہوتا اور نہ یہ ہنگامے جنم لیتے۔

پوری گلی گندے پانی اور بدبو کی لپیٹ میں تھی۔ اِتنے میں کوئی صاحِب جمعدار کو لے آئے۔ اُس نے گٹر کی صفائی کی تو اندر سے بہُت سے پلاسٹک کے لفافے اور شاپنگ بیگ نکلے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد گلی کا پانی تو ختم ہوگیا لیکن گندگی جگہ جگہ پھیلی ہوئی تھی۔

رات کو' کھانے کے بعد' اسد کی امّی نے کُوڑا اِکٹھا کر کے شاپنگ بیگ میں ڈالا اور اسد کو آواز دی "اسد!"

"جی امّی؟"

"یہ کُوڑا باہر پھینک آؤ" امّی نے شاپنگ بیگ اسد کو تھما کر کہا۔

اسد دروازہ کھول کر باہر نکلا اور شاپنگ بیگ گُھما کر گلی میں پھینک دیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اُس کے قدم رُک گئے۔ وہ واپس گلی میں گیا' شاپنگ بیگ اُٹھایا اور چوک میں رکھے ہوئے کُوڑے کے ڈِرم میں پھینک آیا۔

کُہرا کیا ہوتا ہے؟

سردی کے موسم میں سڑکوں اور میدانوں میں جہاں پانی ہو' رات کو یا صبح کے وقت دُھند چھا جاتی ہے۔ اِسی دُھند کو کُہریا کُہرا کہتے ہیں۔ کُہرا ایک قِسم کا بادل ہی ہوتا ہے۔ فرق صرف اِتنا ہے کہ بادل زمین سے بہُت اُوپر ہوتا ہے اور کُہرا بہُت قریب۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہوا جلد گرم ہو جاتی ہے اور زمین اور پانی دیر سے گرم ہوتے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا کا وزن زیادہ ہوتا ہے' اِس لِیے وہ نیچے کی طرف آتی ہے۔ زمین اِتنی ٹھنڈی نہیں ہوتی۔ اُس میں سے بُخارات نکل رہے ہوتے ہیں۔ اُوپر سے آنے والی ٹھنڈی ہوا اِن گرم بُخارات سے مِلتی ہے تو کُہرا بن جاتا ہے۔

کُہر آبادی میں زیادہ ہوتی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ شہروں اور قصبوں کی ہوا میں مٹّی اور پانی کے ذرّے زیادہ ہوتے ہیں۔

کیا آپ مکّھیاں اور مچھّر کھاتے ہیں؟

آپ کہیں گے' کیسی گندی باتیں کرتے ہیں۔ آخ تُھو۔ جی متلانے لگا۔ لیکن بھئی' یہ بات ہے سچّی۔ ہم واقعی مکّھیاں' مچھّر اور دوسرے کیڑے مکوڑے کھاتے ہیں۔ لیکن بِلاواسطہ (Direct) نہیں' بلکہ بالواسطہ (Indirect)۔ اب سُنیے کیسے؟

مُرغیاں اور دوسرے پرندے مکّھیاں مچھّر کھاتے ہیں (جو اُنہیں پروٹین مُہیّا کرتے ہیں)' اور ہم اِن مُرغیوں اور پرندوں کا گوشت کھاتے ہیں۔ اِس طرح ہم پرندوں کے ذریعے مچھّر مکّھیاں کھاتے ہیں۔

آئی بسنت
مُنّے میاں بسنت کے دن پتنگ اُڑا رہے تھے کہ پتنگ کی ڈور دوسری ڈوروں میں اُلجھ گئی۔ آپ بتا سکتے ہیں کہ ان کی پتنگ کی ڈور کون سی ہے؟
A
B
C
D
E

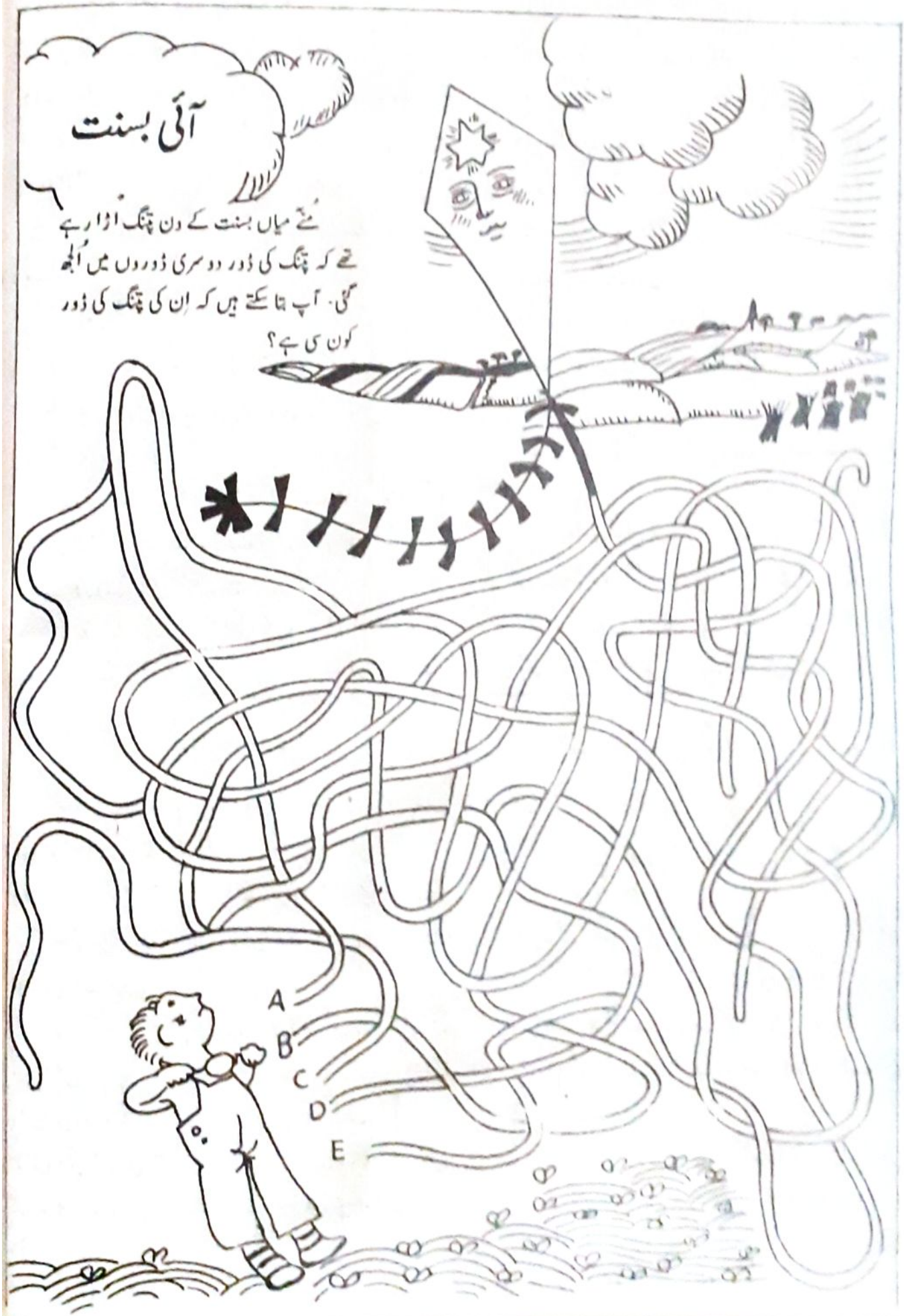

عِلم

زاہد الحسن زاہد

کرو خوب محنت سے تم علم حاصل
اِسی سے مُسافر کو ملتی ہے منزل
اِسی سے ہے اِنسان عزّت کے قابل
کرو خوب محنت سے تُم علم حاصل

ملے علم ہی سے جہاں میں بُزُرگی
جو چوری نہ ہو یہ تو دولت ہے ایسی
بناتی ہے یہ جاہلوں کو بھی عاقل
کرو خوب محنت سے تُم علم حاصل

بھلے اور بُرے کی ہے پہچان اِس سے
بڑھی ہے سدا عقل کی شان اِس سے
اِسی کی بدولت ہے اِنسان کامل
کرو خوب محنت سے تُم علم حاصل

جہاں میں بڑے آدمی جو ہُوئے ہیں
فَقَط علم سے اُن کے رُتبے بڑھے ہیں
بڑا آدمی کب بنا کوئی جاہل؟
کرو خوب محنت سے تُم علم حاصل

ہُوا علم ہی سے جہاں میں اُجالا
یہ کرتا ہے اِنسان کا بول بالا
اگر چاہتے ہو بنو مردِ کامل
کرو خوب محنت سے تُم علم حاصل

نہ تم علم و حکمت سے آنکھیں چُراؤ
جہاں سے بھی مل جائے دولت یہ پاؤ
ہے یہ کام یابی کے دریا کا ساحل
کرو خوب محنت سے تُم علم حاصل

پھُرتیلے ننھے لوگ

سلیم احمد صدیقی

ہم اور آپ کھانا کھانے کے لیے سب سے پہلے ہاتھ دھوتے ہیں، اِس کے بعد دسترخوان یا میز کرسی پر بیٹھتے ہیں، پھر بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم پڑھ کر ہاتھ سے کھانا کھاتے ہیں، البتّہ چاول بعض لوگ چمچے سے کھاتے ہیں۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ ساری دُنیا کے لوگ اِسی طرح کھاتے ہوں گے۔ نہیں، بھئی۔ یہ بات نہیں۔ جس طرح الگ الگ مُلکوں کے لوگ الگ الگ قسم کے لباس پہنتے ہیں اور بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں، اِسی طرح اُن کے کھانے کے انداز اور طریقے بھی جُدا جُدا ہیں۔ یورپ اور امریکا کے لوگ چُھری کانٹوں سے اور چین اور جاپان کے لوگ دو پتلی پتلی تیلیوں سے کھاتے ہیں۔

ارے! یہ کیا؟ آپ چُپکے چُپکے ہنس رہے ہیں۔ لگتا ہے آپ کو یقین نہیں آیا۔ ارے بھئی، ہم سچ کہہ رہے ہیں۔ چینی اور جاپانی لوگ بانس یا لکڑی کی دو تیلیوں سے نہ صرف گوشت اور سبزی بلکہ چاول تک کھاتے ہیں۔ آیئے، ہم آپ کو ذرا تفصیل سے اِس بارے میں بتاتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ آج سے لگ بھگ پانچ ہزار سال پہلے چین میں کچھ لالچی اور پیٹو لوگوں نے تیلیوں سے کھانا کھانے کا طریقہ ایجاد کیا۔ ہُوا یُوں کہ اُس زمانے میں تین ٹانگوں والے برتنوں میں کھانا پکایا جاتا تھا۔ اِن برتنوں کے نیچے آگ جلا دی جاتی تھی اور کھانا تیار ہونے پر اُسے بُجھا دیا جاتا تھا۔ اِس طرح کھانا ٹھنڈا ہونے میں دیر لگتی تھی۔ بعض اوقات، خصوصاً گرم موسم میں تو کھانا ٹھنڈا ہونے میں گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا لگ جاتا تھا۔ اِس پر چند لالچی اور پیٹو لوگوں نے دو پتلی پتلی لکڑیاں لیں اور اُن سے بوٹی پکڑ کر گرم گرم ہی کھانا شروع کر دیا۔ اُن کی دیکھا دیکھی آس پاس کے لوگوں نے بھی اِسی طرح کیا اور زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ پُورے چین میں لوگ تیلیوں سے کھانا کھانے لگے۔ اِس کے بعد وہاں کھانا پکانے میں بھی تبدیلی آگئی۔ اب وہ لوگ گوشت اور سبزی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ کر پکانے لگے تاکہ تیلیوں سے اُٹھانے میں آسانی رہے۔

چمچے بھی چینی لوگوں ہی نے کھانا کھانے کے لیے ایجاد کیے تھے۔ اُن کے چمچے مٹّی چینی کے ہوتے تھے اور اُن کا پیندا چپٹا ہوتا تھا۔ آج کل ہمارے ہاں پلاسٹک کے بعض ڈنر سیٹوں میں اِس قسم کے چمچے ہوتے ہیں۔ اِن چمچوں کا پیندا اِس لیے چپٹا ہوتا تھا کہ کھانے والا شخص چمچے کو میز پر رکھ دے تو اُس میں سے کھانا نہ گرے۔ یہ صِفت ہمارے چمچوں میں نہیں پائی جاتی۔ یورپ اور امریکا کے لوگ چمچے چاول وغیرہ کھانے کے لیے اِستعمال کرتے ہیں جب کہ چین میں اِنہیں صرف یخنی یا سُوپ پینے کے لیے اِستعمال کیا جاتا ہے، لیکن باقی تمام کھانا تیلیوں سے کھایا جاتا ہے۔ یہ تیلیاں بہت نفیس اور خوب صورت ہوتی ہیں اور چینی لوگ چاول بھی

اِنہی سے کھاتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ ایک چاول بھی نہیں گرتا۔ چینی زبان میں اِن تیلیوں کے لیے جو لفظ اِستعمال کیا جاتا ہے' اُس کا مطلب اُردو میں ہوگا "پُھرتیلے ننھّے لوگ"۔ انگریزی میں اِنہیں Chopsticks کہتے ہیں۔

کھانا کھانے کی یہ تیلیاں دس سے بارہ اِنچ تک لمبی اور پنسل یا بال پوائنٹ جتنی موٹی ہوتی ہیں۔ عام تیلیاں تو بانس یا لکڑی کی بنی ہوتی ہیں لیکن امیر لوگ ہاتھی دانت' سونے چاندی یا قیمتی پتّھر کی تیلیاں اِستعمال کرتے ہیں۔ قدیم چین میں بہُت سے امیر لوگ اور شہزادے ہاتھی دانت کی ایسی تیلیاں اِستعمال کرتے تھے جِن کے سِروں پر چاندی کا خول چڑھا ہوتا تھا۔

چین میں کھانے کی میز پر تیلیاں یا تو کھانے والے کے دائیں جانب رکھی جاتی ہیں یا چھوٹی درمیانی رکابی کے نیچے۔ سُوپ کا برتن اِس پلیٹ کے سامنے دائیں جانِب رکھا جاتا ہے اور اُس میں چمچے پیندے کا چمچہ پڑا ہوتا ہے۔ چاولوں کا برتن رکابی کے اُوپر رکھا جاتا ہے اور چینی کھانوں میں چاول ضرور شامل ہوتے ہیں۔

چینی دعوتوں میں سبزی اور گوشت سے تیّار کیے ہُوئے کھانے مہمانوں کے سامنے باری باری لائے جاتے ہیں اور مہمان اُن میں سے ضرورت کے مُطابق اپنی پلیٹوں میں نکال لیتے ہیں۔ سُوپ سب سے آخر میں لایا جاتا ہے۔ لیکن اگر کھانا صِرف گھر کے لوگ ہی کھا رہے ہیں اور کوئی مہمان شریک نہیں ہے تو تمام کھانے اِکٹھے ہی میز پر رکھ دیے جاتے ہیں اور سُوپ کی قاب سب کھانوں کے بیچ میں رکھی جاتی ہے۔

چینی دعوتوں میں تیلیاں اِشارے کے طور پر بھی اِستعمال کی جاتی ہیں۔ کھانے کے شروع میں میزبان مرد یا خاتون اپنی تیلیاں اُٹھا کر اپنے چاولوں کے برتن پر رکھ دیتے ہیں۔ یہ مہمانوں کے لیے اِشارہ ہوتا ہے کہ کھانا شروع کریں۔ اِس کے بعد میزبان چاولوں کے برتن کو رکابی کے ایک جانِب رکھ دیتا ہے اور سب مہمان بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ جو شخص کھانا کھا چُکتا ہے' وہ اپنی تیلیوں کو اپنے چاولوں کے برتن پر برابر برابر رکھ دیتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ کھانے سے فارِغ ہوگیا ہے۔

تیلیوں سے کھانا کھانا کوئی آسان کام نہیں۔ خود چینی بچّے بھی جب اپنے ہاتھ سے کھانا شروع کرتے ہیں تو اُنہیں تیلیوں سے کھانے میں بہُت دُشواری ہوتی ہے۔ تیلیوں کو پکڑنے اور اِستعمال کرنے کا ایک خاص طریقہ ہے اور جب چینی بچّے یہ طریقہ سیکھ جاتے ہیں تو وہ بھی بڑوں کی مانِند بڑی پُھرتی سے کھانے لگتے ہیں۔

کیا آپ بھی یہ طریقہ سیکھنا چاہتے ہیں؟ لیجیے' ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ تیلیوں کو کھانا کھانے کے لیے کس طرح پکڑا جاتا ہے۔ اپنے دائیں ہاتھ کی اُنگلیاں کھول لیں۔ اِس کے بعد پہلی تیلی کو انگوٹھے کی گھائی میں رکھیں۔ تیلی کا چپٹا موٹا سِرا ہاتھ کے پیچھے نِکلا ہُوا ہو۔ اِس کا گول باریک سِرا کھانے کی پلیٹ میں ڈالا جاتا ہے۔ اِس تیلی پر آپ کی گرِفت مضبوط ہونی چاہیئے۔

دُوسری تیلی کو انگوٹھے کے نِچلے سِرے پر ٹِکا کر شہادت

کی اُنگلی اور درمیانی اُنگلی سے پکڑلیں۔ یہ گرفت ڈھیلی ہونی چاہیئے۔ اب آپ پہلی تیلی کو قائم رکھیں گے اور دوسری تیلی کو حرکت دے کر اِن دونوں تیلیوں کے درمیان کسی بھی شے کو پکڑ سکیں گے۔ کیا کہا؟ یہ کام بہت مُشکل ہے؟ جی ہاں، مشکل تو ہے۔ پہلے پہل چینی بچّوں کو بھی اِسے سیکھنے میں دُشواری محسوس ہوتی ہے۔

بہرحال، یہ بات حیرت کی ہے کہ چینی لوگ چاول تک تیلیوں ہی سے کھاتے ہیں، جس کا تصوّر کرنا بھی ہمارے لیے مشکل ہے، کیوں کہ چاول کا دانہ تو بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ پہلے اِس طریقے سے چاول کھانے میں چینیوں کو بھی مُشکل ہوتی تھی، لیکن اُنھوں نے آہستہ آہستہ اپنی مشکل کا حل ڈھونڈ نکالا۔ چاول کھانے کے لیے یہ لوگ برتن کو بائیں ہاتھ میں پکڑ کر مُنہ کے قریب لے آتے ہیں اور اِس کے بعد کھٹاکھٹ تیلیوں کے ذریعے چاولوں کو مُنہ میں ڈالتے جاتے ہیں۔ البتّہ آخری چند چاولوں کو کھانے کے لیے وہ برتن کو ہونٹوں سے لگا لیتے ہیں اور اُنھیں تیلیوں سے (جھاڑو دینے کے انداز میں) مُنہ میں ڈالتے ہیں۔

چینیوں کے تیلیوں سے کھانا کھانے کا طریقہ رفتہ رفتہ آس پاس کے مُلکوں میں بھی رواج پاگیا اور ویت نام اور کوریا کے لوگوں نے بھی اِس طریقے کو اپنا لیا۔ اِس کے بعد آج سے لگ بھگ ڈیڑھ ہزار سال پہلے جاپان میں بھی یہ طریقہ مقبول ہوگیا اور اب اِن تمام مُلکوں کے لوگ تیلیوں ہی سے کھانا کھاتے ہیں۔

چینی لوگ کھانے کی تیلیوں کو اپنی زبان میں "ننھے پُھرتیلے لوگ" کہتے ہیں۔ جاپانی لوگ اِنھیں "ہاشی" کہتے ہیں، جس کا مطلب اُردو میں "پُل" ہے۔ گویا اُن کے خیال میں جس طرح سواری کو دریا پار اُتارنے کے لیے "پُل" اِستعمال کیا جاتا ہے، ویسے ہی کھانے کو برتن سے مُنہ تک لے جانے کے لیے تیلیاں پُل کا کام دیتی ہیں۔ جاپانی تیلیاں چینی تیلیوں سے ذرا مختلف ہوتی ہیں۔ اِن کے کھانے والے سرے گول کی بجائے چپٹے ہوتے ہیں اور یہ بانس یا ہاتھی دانت کی بجائے لکڑی کی ہوتی ہیں۔

تیلیوں کو جاپانی بھی اِسی انداز میں پکڑتے ہیں جس انداز میں چینی لوگ پکڑتے ہیں۔ صدیوں کے اِستعمال سے یہ قومیں اِتنی ماہر ہوگئی ہیں کہ دوسری قوموں کے لوگ جب اِنھیں تیلیوں سے جلدی جلدی کھانا کھاتے دیکھتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں۔

آج سے لگ بھگ پانچ سو سال پہلے اِٹلی کا ایک تاجر، فرانسسکو کارلیتی، تجارت کے سلسلے میں جاپان گیا تو وہاں کے لوگوں کو تیلیوں سے کھانا کھاتے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ واپس آکر اُس نے اپنے سفرنامے میں لکھا:

"اِن دو تیلیوں کے ذریعے جاپانی لوگ اپنے مُنہ کو بڑی پُھرتی سے بھر لیتے ہیں اور کھانے کا ایک ایک ریزہ (چاہے وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو) اپنے ہاتھ گندے کیے بغیر بڑی صفائی سے اُٹھا کر کھا جاتے ہیں!"

پروفیسر جابر سیریز 6
قسط 2

ڈاکٹر رضوان ثاقب

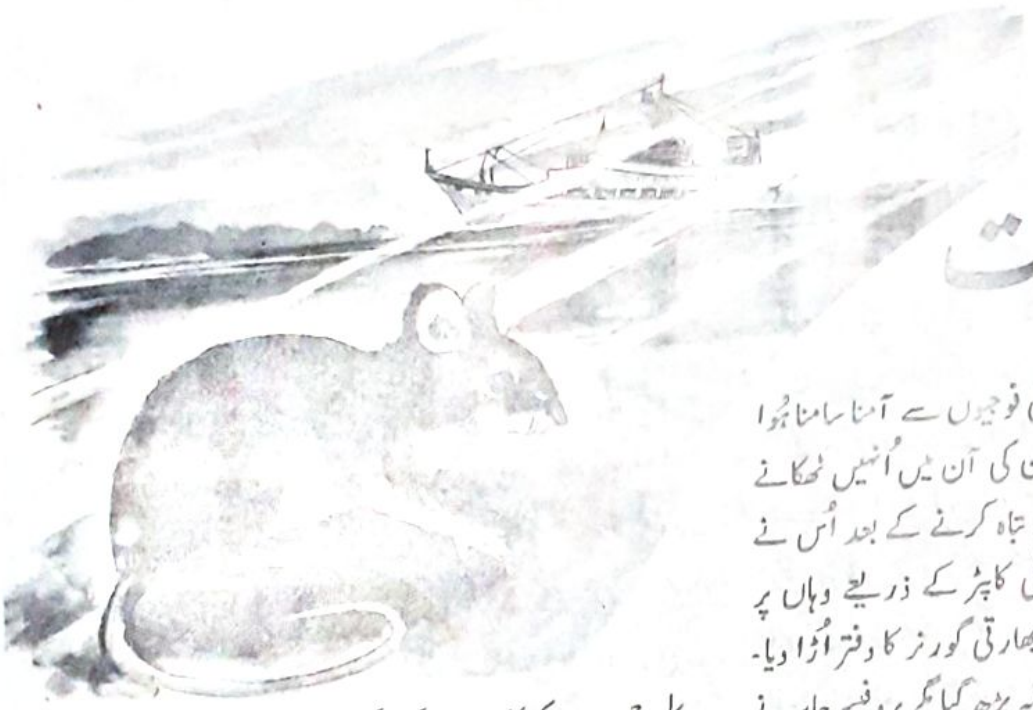

سیاہ موت

جھورے کا کشمیر میں بھارتی فوجیوں سے آمنا سامنا ہوا تو اُس نے اپنی لیزر گن سے آن کی آن میں اُنہیں ٹھکانے لگا دیا۔ پھر کئی بھارتی ٹھکانوں کو تباہ کرنے کے بعد اُس نے اپنے ریموٹ کنٹرول کھلونا ہیلی کاپٹر کے ذریعے وہاں پر موجود اِسرائیلی کمانڈوز سمیت بھارتی گورنر کا دفتر اُڑا دیا۔ اِس سے کشمیری مجاہدین کا حوصلہ بڑھ گیا مگر پروفیسر جابر نے جھورے کو ایک نئی مہم پر روانہ کرنے کے لیے واپس پاکستان بُلالیا۔

سائرہ کراچی کے ساحل پر پھٹنے والے ذرّے تلاش کر رہی تھی کہ اُسے اچانک را کے ایجنٹوں کے اڈّے کا علم ہوگیا، اور اُسے یہ بھی پتا چل گیا کہ یہ لوگ بھارت سے طاعون کے جراثیم بحری جہاز کے ذریعے پاکستان میں اِسمگل کر رہے ہیں تاکہ پاکستان میں بھی اِس وبا سے تباہی پھیلائی جاسکے۔ سائرہ نے جب اِس سازش کے متعلق پروفیسر جابر کو بتایا تو اُنہوں نے اُس جہاز کو روکنے کے لیے جھورے کو سمندر کی طرف روانہ کر دیا۔ جھورا اور اُس کی موٹر بوٹ میں موجود محافظ جہازوں کے پاس رُک کر اُن کے کاغذات چیک کرنے لگے۔ آخر اُنہیں وہ جہاز مِل گیا جس کی اُنہیں تلاش تھی۔ مگر جہاز کی را کے ہیڈ آفس سے کمپیوٹر اور کیمروں کے ذریعے پوری طرح نگرانی ہو رہی تھی۔ اِس لیے جھورے کو کاغذات چیک کرنے کے بعد واپس لوٹنا پڑا۔

دوسری مرتبہ جب جھورے کی بوٹ پوری تیاری کے ساتھ جہاز کے قریب گئی اور جھورا خُفیہ طور پر جہاز پر سوار ہونے لگا تو اُسے ایسا جھٹکا لگا کہ وہ سمندر میں جاگرا اور اِس کے ساتھ ہی جہاز سے موٹر بوٹ پر فائرنگ ہونے لگی۔ لیکن جلد ہی جھورا ایک چور دروازے سے جہاز میں داخل ہوگیا اور پھر چپکے سے جہاز کے عرشے پر پہنچ گیا۔

یہاں پہنچ کر جھورے کو پروفیسر کی طرف سے ہدایات موصول ہونا بند ہوگئیں۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ پروفیسر نومی کو "کی بورڈ" پر بٹھا کر خود کوئی دوسرا تجربہ کرنے لگے تھے جب کہ پیچھے سے نومی "کی بورڈ" پر بیٹھے بیٹھے سوگیا تھا۔ جھورا ہیلو ہیلو کرتا رہا مگر کمپیوٹر کی طرف سے اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ عین اُسی وقت پانچ ہتھیار بند آدمیوں نے جھورے کو پکڑ کر ایک کیبن میں بند کر دیا۔ اب آگے پڑھیے۔

"اوہیں، جھ جھ جھورے، کہاں ہو تم؟ ے ے یہ م م میں ک ک کک کیا دد دد دیکھ رہا ہوں اِسکرین پر" نومی جب اپنی نیند پوری کر کے اُٹھا تو اُس کی نظر کمپیوٹر اِسکرین پر پڑی۔ مگر اِسکرین پر تو مکمّل اندھیرا تھا۔ جھورا کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے اِسکرین کو مزید روشن کرنے کے لیے مُختلف بٹنوں کو دبا کر اِن نقطوں میں جھورے کو ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر اِس سے بھی کچھ حاصل نہ ہوا۔

وہ گھبرا کر پروفیسر کی جانب دوڑا۔

"نومی! کیا ہُوا؟ خیریت تو ہے؟ اِتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟" پروفیسر نے بے تابی سے پُوچھا۔

"وہ، سر، جھورا۔ جھورا، سر۔ وہ، وہ سر، جھورا" نومی ہکلانے لگا "جلدی بتاؤ۔ کیا ہُوا جھورے کو؟" پروفیسر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ کہیں کھو گیا ہے، سر"۔

"کہاں کھو گیا ہے؟ وہ کیسے کھو سکتا ہے؟ تم کھو گئے ہو گے' میرا مطلب ہے سو گئے ہو گے"۔

نومی نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ پروفیسر جابر کمپیوٹر کے کی بورڈ کی طرف دوڑے۔ اُنہوں نے کی بورڈ کے مختلف بٹن دبائے مگر جھورا کہیں نظر نہ آیا۔ پھر اُنہوں نے جھورے سے رابطے کے لیے ایک ایمرجنسی لائن کی فائل کھولی اور جھورے سے پوچھا کہ وہ اِس وقت کہاں ہے؟ جھورے سے کمپیوٹر کا رابطہ ہُوا تو اُسے ایسا لگا جیسے اُس کے جسم میں جان پڑ گئی ہو۔ وہ تو یہ سمجھا تھا کہ اب اُس کا لیبارٹری سے رابطہ مستقل طور پر ٹوٹ چکا ہے۔ بہرحال' اُس نے اپنے گرفتار ہونے کا پُورا واقعہ پروفیسر کو سُنایا اور اُس کمرے کا سارا نقشہ بھی اُنہیں سمجھا دیا۔

پروفیسر نے کہا کہ وہ منی فائبر کمپیوٹر کا بٹن جس پر ایف سِکس لکھا ہے' دروازے کی طرف رُخ کر کے دبا دے۔ جھورے نے پروفیسر کی ہدایت کے مطابق ایسا ہی کیا تو بٹن دباتے ہی ایک شُعاع دروازے سے ٹکرائی اور دروازہ ایک دم راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ جھورا باہر نکلا تو یہ رات کے تین بجے کا وقت تھا۔ کمرے کے باہر دو مُسلّح محافظ بیٹھے اُونگھ رہے تھے۔ چُوں کہ کمرے کا دروازہ جلنے سے آواز پیدا نہیں ہوئی تھی اور نہ شُعلے بھڑکے تھے' اِس لیے اُنہیں کچھ خبر نہ ہوئی تھی۔ جھورا جب موت بن کر اُن کے سر پر پہنچا تو اُس وقت بھی اُنہیں خبر نہ ہوئی۔ اُس کا ہاتھ بڑی خاموشی سے ایک محافظ کے مُنہ پر جم گیا۔ ساتھ ہی اُس نے اُس کے گلے کو بازوؤں کے شکنجے میں لے لیا۔ اُسے بے ہوش ہونے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ لیکن اُس کی لاش نیچے لُڑھکی تو دوسرا محافظ جاگ گیا۔ اِتنی دیر میں جھورا اُس پر رائفل تان چکا تھا۔

"کسی قسم کی حرکت کی تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے!" جھورے نے سرگوشی میں کہا "جلدی بتاؤ' اسلحہ خانہ اور جہاز کا کنٹرول روم کہاں ہے؟"

موت کے خوف نے محافظ کو زبان کھولنے پر مجبور کر دیا۔ جھورے نے اُسے بے ہوش کر کے اُس کی وردی اُتار کر خود پہنی اور رائفل لے کر کنٹرول روم کی طرف چل دیا۔ وہ جیسے ہی ایک موڑ مُڑا' اُس کے قدم جھٹکے سے رُک گئے۔ ایک محافظ کی رائفل اُس کے سینے سے آ لگی تھی۔ اُس کے ہوش اُڑ گئے۔ لیکن اُس وقت اس کا حوصلہ بڑھ گیا جب اُس نے اپنی رائفل کی نال بھی اُس محافظ کے سینے پر ٹکی ہوئی دیکھی۔ اِس میں جھورے کا اپنا کوئی کمال نہ تھا۔ اُس نے رائفل پہلے ہی سے تان رکھی تھی۔ اب جو سامنے آجاتا' اُسے نشانہ بننا ہی تھا۔

جھورے نے محافظ کی طرف دیکھا تو اُس کی حالت بھی جھورے جیسی ہی تھی۔ جھورے نے سر کے اِشارے سے پُوچھا "کیا اِرادہ ہے؟" اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ جھورے نے اُسے ہتھیار پھینکنے کا اِشارہ کیا' لیکن وہ ہچکچا رہا تھا۔ جھورے نے رائفل پر دباؤ ڈالا اور ایسا ظاہر کیا جیسے ابھی گولی چلا دے گا۔ موت سر پر دیکھ کر محافظ نے رائفل نیچے گرا دی۔ جھورے نے اُسے دوسری طرف مُڑنے کا اِشارہ کیا۔ وہ جُوں ہی مُڑا' جھورے نے رائفل کا کُندا اُس کے سر پر دے مارا۔ وہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح فرش پر گر پڑا۔ جھورے نے اُسے گھسیٹ کر تاریکی میں کر دیا اور کنٹرول روم کی طرف جانے لگا۔

جہاز کا کپتان کمپاس کی سُوئی کے مطابق جہاز کا رُخ موڑتا جا رہا تھا۔ جھورے نے کنٹرول روم کے دروازے پر پہنچ کر دستک دی تو کپتان نے سامنے لگے آئینے میں سے دروازے کو دیکھا۔ جھورے کے ہیلمٹ اور وردی سے وہ سمجھا کہ یہ بھی کوئی محافظ ہی ہے اور کچھ پُوچھنے آیا ہے۔ اُس نے دروازے کا بٹن دبا دیا۔ دروازہ کھُل گیا۔ جھورے نے اندر داخل ہوتے ہی رائفل تان کر کہا "جہاز کا رُخ بمبئی کی بندرگاہ کی طرف کر کے اِسے خودکار کر دو!"

"ج ج جناب' پہلے مجھے اِعلان تو کرنے دیں کہ ہمارا

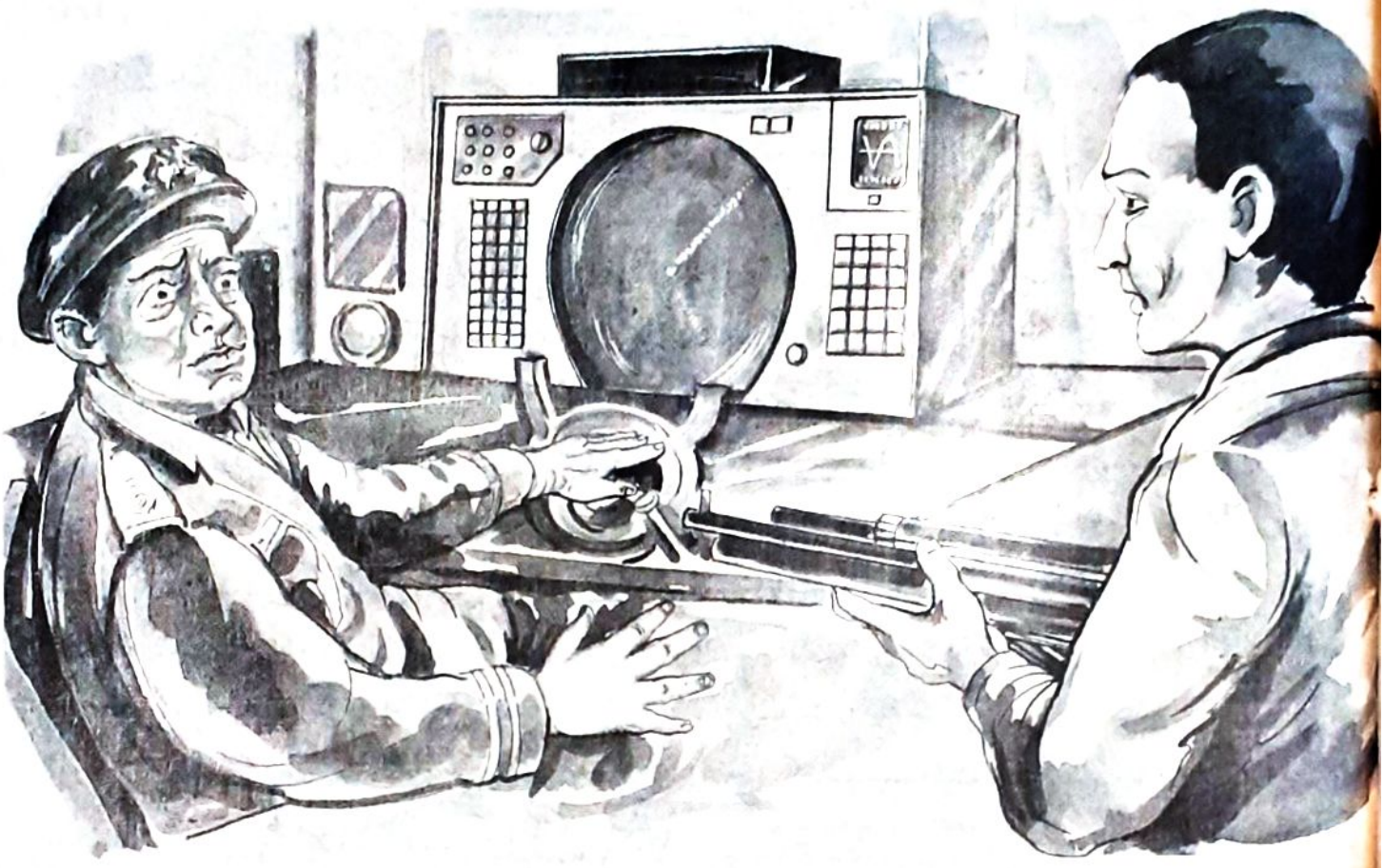

جہاز اِغوا ہو چکا ہے" کپتان نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"خبردار! اگر وائرلیس سیٹ کا رُخ کیا تو یہ گولی تمہارے سینے کا رُخ کرے گی"۔ جھورے نے رائفل کی لبلبی پر اُنگلی جماتے ہوئے کہا۔

"آپ---- آپ کشمیری مُجاہد ہیں؟" کپتان نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "سر' آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گا۔ لیکن مجھے جان سے نہ ماریئے گا"۔

یہ کہہ کر کپتان نے جہاز کا رُخ بھارت کی بندرگاہ بمبئی کی طرف کر کے اُس کے نِظام کو خودکار کر دیا۔ اب جھورے نے کپتان کو مضبُوطی سے باندھا اور دروازے میں تالا لگا کر اَسلحہ خانے کا رُخ کیا۔ آخر وہ چُھپتے چُھپاتے اَسلحہ خانے تک پہنچ گیا۔ لیکن یہاں بھی دو مُسلّح پہرے دار موجود تھے۔ اُنہوں نے جھورے کو دیکھتے ہی اُس پر رائفلیں تان لیں لیکن فائر نہیں کیا' کیوں کہ جھورے نے بھی اُنہی جیسی وردی پہنی ہوئی تھی۔ تاہم اُنہوں نے اُسے آج پہلی بار دیکھا تھا۔

"کون ہو تُم؟" ایک پہرے دار نے پوچھا۔

"میرا نام منظور حُسین ہے۔ لیکن میں اپنا پورا تعارُف کروانے سے پہلے تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ تمہارا جہاز اِغوا ہو چکا ہے اور اِس وقت تمہارا کپتان نہیں میرے ساتھی اِسے چلا رہے ہیں۔ تم وائرلیس کے ذریعے اِس بات کا یقین کر سکتے ہو"۔

دونوں پہرے داروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر اُن میں سے ایک نے وائرلیس کو آن کر کے کنٹرول رُوم سے رابطہ کیا۔ لیکن وہاں سے کوئی جواب نہ ملا۔ جھورے نے دوبارہ کہا "تم اِس وقت ہماری حِراست میں ہو۔ تمہارے چاروں طرف میرے ساتھی اَسلحہ تانے کھڑے ہیں۔ اِس لیے کوئی حرکت نہ کرنا' ورنہ انجام بہُت بُرا ہوگا۔ اپنی رائفلوں کو نیچے پھینک دو اور ہاتھ کھڑے کر دو"۔

دونوں پہرے داروں کو یقین ہو گیا تھا کہ اُن کا جہاز

اِغوا ہو چکا ہے۔ لہٰذا اُنہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ جھورے نے آگے بڑھ کر اُن کی رائفلیں اپنے قبضے میں لے لیں اور اُنہیں ایک خالی کمرے میں بند کر دیا۔ اِس کے بعد وہ اَسلحہ خانے میں داخل ہوگیا۔ لیکن اِس سے آگے وہ کیا کرے؟ یہ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ فائبر کمپیوٹر کے ذریعے پروفیسر کی جو ہدایات اُسے موصول ہوئی تھیں وہ یہاں تک ہی تھیں۔ آگے نہ جانے کیوں ہدایات آنا بند ہوگئی تھیں۔ وہ کچھ پریشان ہوا' لیکن اِس کے ساتھ ہی اُسے خیال آیا کہ جو ڈائنامائیٹ وہ اپنے ساتھ لایا تھا اور تلاشی کے دوران میں اُس سے لے لیے گئے تھے' وہ یہیں کہیں ہوں گے۔ وہ اب اسلحہ خانے میں ڈائنامائیٹ ڈھونڈ رہا تھا۔

اِس دوران میں پروفیسر جابر فجر کی نماز پڑھنے چلا گیا تھا اور اُس کا جھورے سے رابطہ ختم ہوگیا تھا۔ پروفیسر نے نماز کے بعد کی بورڈ پر بیٹھے ہوئے جھورے کو اِسکرین پر دیکھا۔ اِتنی دیر میں جھورا ڈائنامائیٹ تلاش کر چکا تھا۔ پروفیسر نے اُسے اَسلحہ خانے اور کنٹرول روم میں ڈائنامائیٹ لگا کر ٹائم مُقرّر کرنے کی ہدایت کی۔ اِس کے بعد اُنہوں نے کہا کہ وہ جہاز میں سے موٹر بوٹ لے کر فرار ہو جائے۔

را نے اگرچہ اپنے جہاز میں جدید حِفاظتی نِظام قائم کر رکھا تھا' لیکن اِس کے باوجود اُنہوں نے مزید حِفاظت کے لیے اُس کے پیچھے چند موٹر بوٹیں بھی روانہ کر دی تھیں۔ پروفیسر جابر کمپیوٹر کے پاس بیٹھے جھورے کی سرگرمیوں کا مُشاہدہ کر رہے تھے۔ ڈائنامائیٹ ڈھونڈنے کے بعد جُھورا جب کنٹرول روم کے ایک خاص حصّے میں گیا تو پروفیسر چونک اُٹھے۔ کمپیوٹر خاص قسم کے اِشارے دے رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ جہاز کا باہر کسی سے ریڈیائی رابطہ ہے اور یقینی طور پر یہ رابطہ را کے کسی مرکز سے ہی ہو سکتا تھا۔ پروفیسر نے جھورے کو خبردار کیا۔ جھورا یہ سُن کر تشویش میں مُبتلا ہوگیا۔ لیکن جلد ہی اُس نے اُن نِگران آنکھوں کو ڈھونڈ لیا جو اُس کی ہر ہر حرکت کی رپورٹ کسی کو پہنچا رہی تھیں۔ یہ دو آنکھیں دو خُفیہ کیمرے تھے۔ جھورے نے ایک مِنٹ کی دیر کیے بغیر انہیں تباہ کر دیا اور بڑی پھرتی سے ڈائنامائیٹ لگا دیے۔

یہ کام مُکمّل کرتے ہی وہ جہاز کے نِچلے حصّے کی طرف بڑھا۔ وہ یہاں سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار ہونا چاہتا تھا۔ جہاز کی تباہی میں چند مِنٹ باقی تھے۔ تھوڑی دیر بعد طاعون جسے بلیک ڈیتھ یعنی سیاہ موت کہتے ہیں' کے سوداگر پانی میں غرق ہونے والے تھے۔ لیکن جھورے کی اچانک دل کی دھڑکن تھم سی گئی کیوں کہ دو موٹر بوٹیں اُس کی طرف تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ وہ بمبئی کی طرف سے آ رہی تھیں۔ اُن میں موجود آدمی اپنی گنوں کا رُخ جھورے کی طرف کیے ہوئے تھے۔

آنے والے وقت کا تصوّر کر کے جھورے کی رُوح

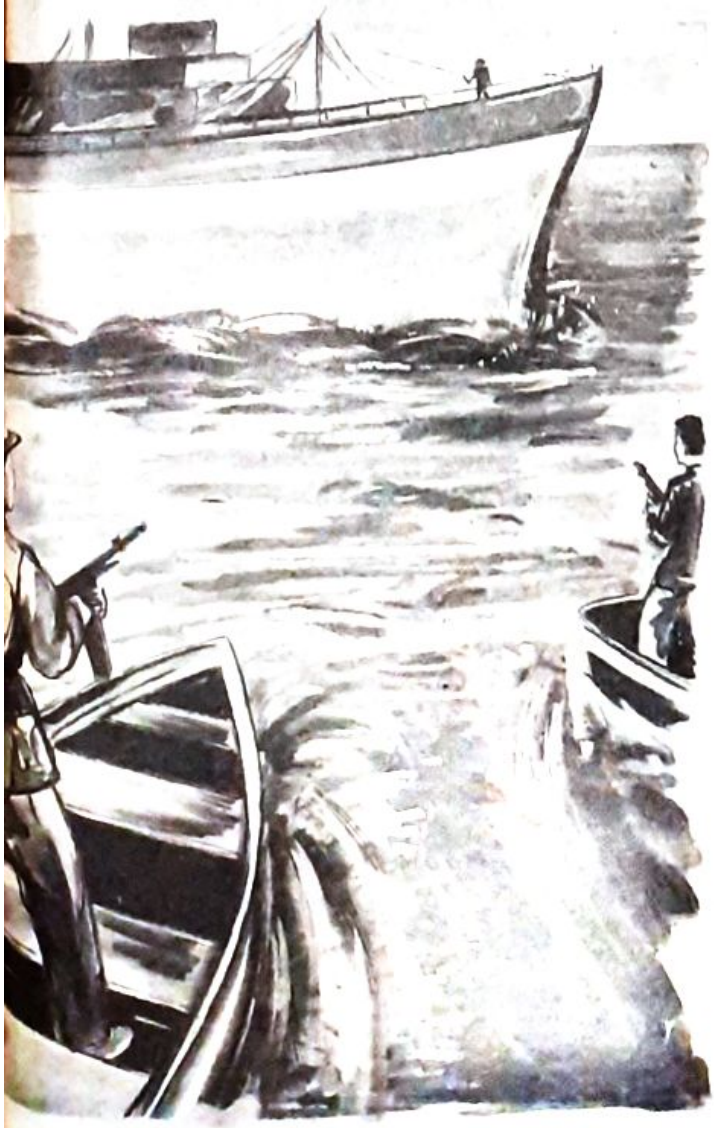

کانپ اُٹھی۔ وہ اگر چند منٹ مزید جہاز میں ٹھہرتا تو جہاز کی تباہی کے ساتھ خود بھی تباہ ہو جاتا اور اگر موٹر بوٹ کے ذریعے سمندر میں اُترتا تو اُس کا پیچھا کرنے والے اُسے بھون ڈالتے۔ اُس نے بوکھلا کر پروفیسر سے رابطہ کیا۔ پروفیسر خود بھی ساری صورتِ حال کا جائزہ لے رہے تھے اور جہاز کی تباہی کے ساتھ ساتھ وہ جھورے کو بھی صحیح سالم بچانا چاہتے تھے۔ پروفیسر نے اِسکرین پر دیکھا کہ جہاز کے عرشے کے جنگلے کے ساتھ ساتھ مشین گنیں لگی ہوئی ہیں تو اُنہوں نے جھورے سے کہا کہ فوراً جنگلے پر پہنچ کر مشین گن کا فائر موٹر بوٹوں پر کھول دے۔ جھورے نے یہ کام بجلی کی سی تیزی سے کیا۔ آنے والی بوٹیں اپنے انجام کو پہنچ چکی تھیں۔ اب جھورا جہاز کے نچلے حصّے کی جانب دوڑا تاکہ وہاں سے موٹر بوٹ لے کر فرار ہو سکے۔ نچلے حصّے میں موجود جہاز کا عملہ فائرنگ کی آواز سُن کر یہ سمجھا تھا کہ جہاز پر حملہ ہوگیا ہے، اِس لیے وہ لوگ کہیں چُھپے بیٹھے تھے۔

جھورا موٹر بوٹ لے کر سمندر میں اُترا اور اُسے اِسٹارٹ کر کے اپنے دماغ میں لگے ہوئے فائبر کمپیوٹر کی مدد سے کراچی کی بندرگاہ کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ ابھی تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ اُسے ایک کے بعد ایک کئی دھماکوں کی آوازیں سُنائی دیں۔ اُس نے پیچھے کی طرف دیکھا تو جہاز طاعون کے جرثوموں اور اُس کے سوداگروں سمیت سمندر کی تہ میں ڈوب رہا تھا۔

اور پھر کچھ ہی دیر بعد جھورا بالکل صحیح سالم بندرگاہ پر پہنچ گیا، جہاں بریگیڈیئر طاہر نے اُس کا بڑے جوش و خروش سے اِستقبال کیا، شہر کے لوگوں نے اُسے پھولوں کے ہار پہنائے اور چھوٹی بچیّوں نے پتّیاں نچھاور کیں۔

شُتر مُرغ گھونسلا کہاں بناتا ہے؟

شُتر مُرغ سب سے بڑا پرندہ ہے (لیکن اُڑ نہیں سکتا)۔ اِس (کی مادہ) کا انڈا بھی سب پرندوں سے بڑا ہوتا ہے یعنی کوئی سَوا کِلو وزنی۔ اِس کے ایک انڈے کا آملیٹ 12 آدمی کھا سکتے ہیں۔

پرندے انڈے دینے اور بچّوں کو پالنے پوسنے کے لِیے گھونسلے بناتے ہیں۔ بعض پرندوں کے گھونسلے درختوں پر ہوتے ہیں اور بعض کے جھاڑیوں میں۔ کچھ پرندے مکانوں کے چھجّوں، روشن دانوں اور چمنیوں میں گھونسلے بناتے ہیں۔ لیکن ایسا پرندہ کہاں گھونسلا بنائے جو نہ تو اُڑ سکتا ہے نہ تیر سکتا ہے؟ ہماری مُراد شُتر مُرغ سے ہے۔

شتر مُرغ افریقہ اور جنُوب مغربی ایشیا کے خُشک اور کُھلے میدانوں میں رہتے ہیں۔ یہ اپنے گھونسلے کھلی جگہ بناتے ہیں اور اُنہیں چُھپانے کی کوشش نہیں کرتے۔ جب انڈے دینے کا وقت آتا ہے تو شتر مُرغ اور اُس کی تین چار مادائیں کوئی چھوٹا سا گڑھا تلاش کرتے ہیں۔ اگر وہ کم گہرا ہو تو اس کو پنجوں سے کھُرچ کر اور گہرا کر لیتے ہیں۔ یہ گڑھا عُموماً تین میٹر لمبا اور اِتنا ہی چوڑا ہوتا ہے۔ اِسی گڑھے میں شُتر مُرغ کی مادہ چھ سے آٹھ تک انڈے دیتی ہے۔

مادہ انڈوں پر بیٹھ کر اُنہیں سیتی نہیں ہے جیسا کہ دوسرے پرندوں کی مادائیں کرتی ہیں۔ وہ انڈوں کے درمیان بیٹھ جاتی ہے اور پر پھیلا کر اُن پر سایہ کر دیتی ہے تاکہ وہ سورج کی گرمی سے محفوظ رہیں۔ شتر مُرغ پاس کھڑا پہرا دیتا رہتا ہے۔ اِس طرح انڈے دوسرے جانوروں سے محفوظ رہتے ہیں۔ (س-ل)

فاروق حسن چانڈیو

سوا سو کی گھڑی

ثمیر کو ایسا کوئی موقع یاد نہ تھا جب اس کی کوئی خواہش آسانی سے پوری ہوگئی ہو۔ اُس کی زیادہ فرمائشیں تو سِرے سے ہی رد کر دی جاتی تھیں۔ بہت کم فرمائشیں رونے دھونے اور ڈانٹ ڈپٹ سُننے کے بعد پُوری ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ اُس نے اپنے ایک ہم جماعت علی کے پاس جیبی وِڈیو گیم دیکھا تو اُسے بھی شوق ہوا کہ وہ بھی یہ گیم خریدے۔ اُس نے گھر جاکر والِدہ سے وڈیو گیم خریدنے کے لِئے کہا تو وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولیں "ثمیر' بیٹے' وڈیو گیم خراب چیز ہے۔ اِس میں پڑ کر بچّہ پڑھائی سے غافِل ہو جاتا ہے"۔

ثمیر کو والِدہ کا جواب بالکُل اچّھا نہ لگا تھا۔ مگر ضِد کی صورت میں پٹائی ہونے کا خطرہ تھا۔ اِس لِیے دل پر جبر کر کے خاموش ہوگیا۔ کچھ دن بعد جُنید کے پاس چابی سے چلنے والی ننھّی سی کار دیکھ کر اُس کا دل مچل گیا۔ اُس نے والِدہ سے چابی والی کار کی فرمائش کی تو اُنہوں نے کہا "کوئی ضرورت نہیں اِن بے کار چیزوں کی" یہ اُنہوں نے ایسے لہجے میں کہا تھا کہ ثمیر کو کچھ بولنے کی ہمّت ہی نہ ہو سکی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اُس کی امّی اُس کی ہر خواہش کو کیوں ٹھکرا دیتی ہیں؟ لیکن سوچنے کے باوجود کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔

اُسے سب سے زیادہ صدمہ اِمتحان کے نتیجے والے دِن ہُوا تھا۔ وہ چھٹی جماعت میں اوّل آیا تھا اور نتیجہ سُن کر خوشی سے جھوم گیا تھا۔ وہ اُڑ کر ماں کے پاس پہنچنا چاہتا تھا تاکہ اُنہیں یہ خوش خبری سُنا کر ڈھیروں شاباش اور کوئی اچھا سا اِنعام حاصل کرے۔ وہ رِزلٹ کارڈ لے کر گھر گیا اور دروازے پر ہی چیخ چیخ کر کہنے لگا "امّی' میں پاس ہوگیا ہُوں...... امّی' میں کلاس میں اوّل آیا ہُوں"۔

اُس کی والِدہ اُس وقت کپڑے دھو رہی تھیں۔ بیٹے کی آواز سُن کر اُس کی طرف لپکیں کہ گلے لگا کر پیار کریں مگر قریب پہنچ کر سوچوں میں کھو گئیں۔ بیٹے کو مُبارک باد تک نہیں دی۔ ماں کو سوچوں میں کھویا ہُوا دیکھ کر ثمیر سے صبر نہ ہو سکا۔ وہ چیخ کر بولا "امّی...... امّی......... میں فسٹ آیا ہُوں' پوری کلاس میں"۔ اِس پر ماں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا اور سر پر ہاتھ پھیر کر مُبارک باد دی۔

ثمیر خالی خولی مُبارک باد کے الفاظ سُن کر مایوس ہوگیا اور بولا "میں نے اِتنا بڑا کارنامہ کیا ہے' اور آپ صرف مبارک باد دے رہی ہیں۔ اِنعام نہیں دیں گی؟"

"اِنعام؟ کیسا اِنعام؟" ماں نے کہا "چھٹی جماعت کا اِمتحان کوئی بہت بڑا اِمتحان نہیں ہوتا۔ جب تم میٹرک کے اِمتحان میں اوّل پوزیشن حاصِل کرو گے تو پھر اِنعام دُوں گی"۔

سُمیر کو ماں کے اِس جواب پر دُکھ سے زیادہ غُصّہ آیا۔ اِس لِیے وہ رویا دھویا نہیں۔ اُس نے کہا "آپ کو تو مُجھ سے نفرت ہے"۔ یہ کہہ کر پاؤں پٹختا ہُوا گھر سے باہر نکلا اور گلی میں لگے ہوئے نیم کے درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اُس کے دماغ میں ہل چل مچی ہوئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اُس کی والِدہ اُس سے نفرت کرتی ہیں۔ جب ہی تو اُنہوں نے اُس کی کام یابی پر اُسے کوئی اِنعام نہیں دیا۔ لیکن وہ کیوں نفرت کرتی ہیں؟ اِس سوال کا کوئی جواب اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

وہ کافی دیر تک سوچتا رہا۔ آخر اُس نے فیصلہ کیا کہ رات کو ابّو آئیں گے تو وہ اُنہیں اپنی کام یابی کی خوش خبری سُنائے گا۔ وہ یقیناً بہت خوش ہوں گے، اُسے پیار کریں گے اور اِنعام بھی دیں گے۔ مگر ابّو تو بہت دیر سے آتے ہیں۔ اُس وقت تک تو وہ سو جاتا ہے۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ آج رات میں جاگتا رہُوں گا۔

وہ مغرب تک باہر بیٹھا رہا۔ اِس کے بعد گھر آگیا۔ اب اُسے اپنے والِد کا شِدّت سے اِنتظار تھا۔ وہ بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ اِسی دوران میں رات کے کھانے کا وقت ہوگیا۔ والِدہ نے اُسے آواز دی۔ وہ اُن سے ناراض تو بہت تھا مگر بھوک بھی شدید لگ رہی تھی۔ دوپہر کو بھی کچھ کھائے بغیر باہر نکل گیا تھا۔ اِس لِیے مُنہ پُھلائے کھانا کھانے لگا۔ کھانے کے بعد دونوں ماں بیٹے اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ ماں کو تو جلد ہی نیند آگئی مگر سمیر آنکھیں کھولے لیٹا رہا۔ لیکن وقت تھا کہ کٹ ہی نہیں رہا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کے والِد رات کے گیارہ بجے فیکٹری سے آتے ہیں۔ وہ بار بار اپنی پچیّس روپے والی الیکٹرانِک گھڑی کو دیکھ رہا تھا۔ آخر جیسے تیسے کر کے اِنتظار ختم ہُوا اور دروازے پر دستک کی آواز سُنائی دی۔ وہ لپک کر اُٹھا اور دوڑ کر دروازہ کھول دیا۔

اِتنی رات گئے سُمیر کو دروازے پر دیکھ کر اُس کے والِد کو حیرت ہُوئی۔ وہ اُس سے رات گئے تک جاگنے کی وجہ پُوچھنا ہی چاہتے تھے کہ اُس نے اُن کو اِمتحان میں اپنی کام یابی کی خبر سُنائی۔ یہ سُن کر اُس کے والِد بہت خوش ہوئے اور اُسے سینے سے لگا کر خوب پیار کیا۔ وہ بار بار واہ وا! مُبارک ہو! مُبارک ہو! کہہ رہے تھے۔ اُن کے اِس رَوَیّے سے سُمیر بے اِنتہا خوش ہوا، اِتنا خوش کہ والِدہ کے خراب رَوَیّے کو بھی بھول گیا۔

کچھ دیر بعد اُس کے والِد نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر کہا "یہ لو، بیٹے، تمہارا اِنعام۔"

روپیہ دیکھ کر سُمیر کی ساری خوشی ہرن ہوگئی۔ وہ سوچنے لگا کہ والد نے بھی یوں ہی دکھاوے کی خوشی کا اِظہار کیا تھا۔ اگر واقعی وہ خوش ہوتے تو صِرف ایک روپیہ اِنعام

نہ دیتے۔ اِتنے بڑے کارنامے پر صرف ایک روپیہ اِنعام؟ نہیں، نہیں۔ ابّو بھی مجھ سے محبّت نہیں کرتے۔

"بھئی! کیا سوچنے لگے؟" ابّو نے اُس سے پُوچھا۔ سمیر کا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر روئے مگر والِدہ کی ڈانٹ کے خوف سے ایسا نہ کر سکا۔ صرف اِتنا کہا "کوئی ضرورت نہیں اِنعام کی۔ میں پاس ہوگیا ہُوں۔ یہی اِنعام بہُت ہے"۔

"نہیں، بیٹے۔ تمہیں کچھ نہ کچھ اِنعام تو ملنا ہی چاہیئے"۔ یہ کہَ کر اُنھوں نے روپیہ سمیر کی جیب میں ڈال دیا۔ اِتنی دیر میں سمیر کی امّی کھانا گرم کر کے لے آئی تھیں۔ ابّو کھانا کھانے بیٹھ گئے۔

سُمیر رات گئے تک بستر پر پڑا سُلگتا رہا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ آخر کافی رات گئے مہربان نیند نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

صبح کو بیدار ہونے کے بعد اُس کے دل کا غُبار کافی کم ہوگیا تھا۔ اُس نے اپنے دل میں اب پکّا اِرادہ کر لیا کہ آیندہ اپنے ماں باپ سے کوئی اُمید نہ رکھے گا۔

اُنہی دنوں سُمیر کا ایک ہم جماعت تنویر سوا سو روپے کی نئی گھڑی باندھ کر اِسکول آیا اور بڑے فخر سے ہم جماعتوں کو دکھانے لگا۔ اُس کی گھڑی دیکھ کر فہیم نے کہا "میں بھی دو چار دِنوں میں ایسی ہی گھڑی لے لوں گا" یہ کہَ کر اُس نے سمیر سے کہا "تم بھی اب اپنی اِس پچّیس روپے والی گھڑی کو پھینک کر سوا سو روپے والی گھڑی لے لو"۔

"نہیں، بھئی۔ یہی ٹھیک ہے" سمیر نے جواب دیا۔

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ تمہارے ماں باپ تمہیں گھڑی لے کر نہیں دیں گے؟" فہیم نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں لے کر دیں گے؟ ضرور دیں گے" سمیر نے اپنا بھرم رکھنے کے لیے الفاظ پر زور دے کر کہا۔

"تو پھر لے کر دکھاؤ" فہیم نے اُسے چیلنج کیا۔

بہُت سے لڑکے اُن کی یہ گفت گُو سُن رہے تھے۔ اُن کے سامنے سُمیر کو سُبکی محسوس ہوئی اور اُس نے فہیم کا چیلنج قبول کر لیا۔ مگر اُسے خود یقین نہیں تھا کہ اُس کے ماں باپ اُس کی فرمائش پوری کر دیں گے۔ وہ اِسکول سے واپسی پر راستے بھر سوچتا رہا تھا کہ کس طرح والدہ کو گھڑی دلانے پر آمادہ کرے۔ مگر کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ یوں ہی سوچتے سوچتے وہ گھر پہنچ گیا۔

اُس وقت اُس کی ماں باورچی خانے میں دال بگھار رہی تھیں۔ وہ ڈرتے ڈرتے اُن کے پاس گیا اور بڑے پیار سے بولا "امّی، وہ تنویر ہے ناں، میرا کلاس فیلو۔ اُس کی امّی نے اُسے سوا سو روپے کی گھڑی خرید کر دی ہے۔ آپ مجھے بھی ویسی ہی گھڑی دِلوا دیں"۔

"تمہارے پاس گھڑی ہے تو۔ وقت دیکھنے کے لیے وُہی کافی ہے" ماں نے کہا۔

"یہ پچّیس روپے والی گھڑی دیکھ کر میرے دوست میرا مذاق اُڑاتے ہیں۔ اُن کے پاس بہُت خوب صورت اور قیمتی گھڑیاں ہیں۔ شکُور کے پاس تو ہزار روپے والی گھڑی ہے۔ میں تو..... میں تو صرف سوا سو والی گھڑی کا کہَ رہا ہوں..... امّی، امّی، اچھّی امّی جان، مجھے گھڑی دِلوا دیں" سُمیر نے خوشامد کرتے ہوئے کہا۔

والِدہ نے جب دیکھا کہ سمیر نرمی سے نہیں سمجھ رہا تو سخت لہجے میں بولیں "اب زیادہ باتیں مت کرو۔ کوئی ضرورت نہیں بِلاوجہ فضول خرچی کرنے کی" یہ کہَ کر وہ کام کاج میں مصروف ہوگئیں۔

کچھ دیر بعد اُنھوں نے اُسے آواز دی "سُمیر، ہاتھ مُنہ دھولو۔ کھانا تیّار ہے۔"

"نہیں، میں کھانا نہیں کھاؤں گا" سُمیر نے روہانسی آواز میں جواب دیا۔

ماں نے اُسے بہُت سمجھایا بُجھایا مگر وہ نہ مانا۔ آخر اُنھوں نے اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اُس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ یُوں ہی بھُوکے پیٹ بستر پر لیٹ گیا۔

سُمیر کے والِد، سمیع الدّین، کپڑے کی فیکٹری میں کام

کرتے تھے۔ اُن دنوں اُن کی رات کی ڈیوٹی تھی اور وہ رات کو گیارہ بارہ بجے آتے تھے۔ اُس رات وہ فیکٹری سے واپس آئے تو کچھ تھکے تھکے سے تھے۔

بیوی نے فوراً کھانا گرم کیا اور اُن کے سامنے رکھتے ہوئے بولی "آج سمیر نے نہ دوپہر کا کھانا کھایا اور نہ رات کا"۔

سمیع الدّین نے نوالا واپس چنگیر میں رکھ دیا اور بولے "کیا طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟"

بیوی نے کہا "پہلے کھانا کھالیں' پھر پوری بات بتاؤں گی"۔

"میرا بیٹا بھوکا سوگیا ہے اور تم کہہ رہی ہو میں کھانا کھا لوں؟ مجھے حیرت ہے کہ تم نے کیسے کھانا کھالیا؟" سمیع الدّین نے کہا۔

"میں..... میں..... میں نے بھی نہیں کھایا" بیوی نے اٹک اٹک کر کہا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ہُوا کیا؟ کچھ بتاؤ تو سہی؟" سمیع الدّین نے بے چین ہو کر پُوچھا۔

اِس پر بیوی نے شوہر کو گھڑی والی بات بتائی اور پھر امتحان والے دن کا واقعہ سُناتے ہوئے کہا "بچّے نے کلاس میں اوّل پوزیشن لی ہے مگر..... مگر..... میں نے نہ تو اُسے پیار کیا نہ بہت زیادہ خوشی ظاہر کی' اِس خوف سے کہ کہیں وہ اِنعام نہ مانگ بیٹھے۔ میں بھلا اُسے اِنعام کہاں سے دیتی؟ کاش! کاش!" وہ آگے نہ بول سکی اور بلک بلک کر رونے لگی۔

سمیع الدّین کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ اُنھوں نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا "یہ غریبی بھی کتنی بُری چیز ہے۔ اِس کی وجہ سے بچّے ماں باپ سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ وہ کیا جانیں کہ والدین کے پاس پیسے ہیں یا نہیں۔ والدین اُن کی خواہش پوری نہیں کرتے تو وہ سمجھتے ہیں کہ اُن کے والدین اُن سے محبّت نہیں کرتے۔ خیر' میں سمیر کی گھڑی والی خواہش ضرور پوری کروں گا"۔

"مگر پیسے کہاں سے لائیں گے؟ آپ کی تنخواہ سے تو گھر کا کرایہ' دو وقت کا کھانا اور سمیر کا پڑھائی کا خرچہ ہی بہت مُشکل سے چلتا ہے" بیوی نے فکر مند لہجے میں کہا۔

"میں ایک مہینا پیدل فیکٹری جاؤں گا اور وہاں چائے پینا بھی بند کر دوں گا۔ اِس طرح سوا سو روپے بچا کر سمیر کو گھڑی دِلا دوں گا"۔

"آپ تین میل پیدل جائیں گے اور تین میل پیدل واپس آئیں گے؟" بیوی نے بہت دُکھی لہجے میں کہا۔

"ارے بھئی' یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میں تو اپنے سمیر کی خاطر جان بھی دے سکتا ہوں" سمیع الدّین نے کہا۔

سمیر کو دو وقت کھانا نہ کھانے کی وجہ سے نیند نہیں آئی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے اپنے والدین کی باتیں سُن رہا تھا۔ اب وہ سمجھ گیا تھا کہ اُس کے ماں باپ اُسے کتنا چاہتے ہیں۔ اُس کے والد نے اُسے گھڑی دِلانے کی غرض سے پیدل کام پر جانے کا فیصلہ کیا تھا اور ماں نے اُس کی وجہ سے کھانا نہیں کھایا تھا اور اُس کی خواہش پوری نہ ہونے کے غم میں بلک بلک کر رو پڑی تھی۔ یہ سوچ کر اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اُس نے جلدی سے آنسو خشک کیے' والد کے پاس گیا اور اُن سے لپٹ کر کہا "ابّو' میں غلطی پر تھا۔ مجھے مُعاف کر دیں"۔ اُس نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر اُن سے بھی مُعافی مانگی اور پھر ہنس کر بولا "اب کچھ کھانے پینے کا بندوبست کریں۔ کیا بھوکا مارنے کا اِرادہ ہے؟"

کھانا کھاتے ہوئے سمیر نے کہا "مجھے سوا سو روپے کی گھڑی نہیں چاہیئے۔ میرے لیے یہ 25 روپے کی گھڑی ہی کافی ہے۔ اِس کے علاوہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اِسکول پیدل جایا کروں گا۔ صرف ایک میل ہی تو دُور ہے۔ اِس طرح پیسے بھی بچیں گے اور میری ورزش بھی ہو جائے گی"۔

اُس وقت وہ اپنی عُمر سے بہت بڑا معلوم ہو رہا تھا۔ اُس کے والدین ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

کایا پلٹ

اشفاق احمد خاں

دلاور سے مجھے اِنتہا کی نفرت تھی۔ قصبے کے ٹی ہاؤس میں میری اُس سے ملاقات ہوئی سی۔ میں اپنی میز پر تنہا بیٹھا تھا کہ اچانک ایک بھاری بھرکم جسم والا آدمی میرے سامنے آ بیٹھا۔ میں نے ناگواری سے اُسے دیکھا لیکن اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر خاموش ہوگیا۔ مگر اُس وقت میرے غصّے کی اِنتہا نہ رہی جب اُس نے میرے سامنے پڑا ہوا اخبار اُٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ میرا دل چاہا کہ اُس کے ہاتھ سے اخبار چھین لوں لیکن اُس کے بھاری بھرکم جسم کو دیکھ کر حوصلہ نہ ہُوا۔ چُناں چہ میں بے بسی کے گھُونٹ پی کر رہ گیا۔

چند مِنٹ بعد اُس نے چائے منگوائی۔ اب اندازہ کریں، چائے پینے کا بھی ایک طریقہ ہوتا ہے۔ لیکن اُس نے جس زور و شور سے چائے پینا شروع کی، اُس نے میرے ہی نہیں اِردگِرد بیٹھے لوگوں کے چہروں پر بھی کچھ اچھّا اثر نہیں ڈالا۔ بہُت سے لوگ اُسے ناگواری سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن اُس پر ذرّہ برابر اثر نہیں ہُوا۔ وہ اُسی طرح بلند آواز سے اپنا شغل جاری رکھے ہوئے تھا۔ سُڑک سُڑک کی کرخت آواز ٹی ہاؤس میں گونج رہی تھی اور میرا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔ میری خواہش تھی کہ وہ میرے خیالات کو محسوس کرلے۔

عین اُسی لمحے اُس نے چائے ختم کر کے میز پر رکھی اور میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر اُس نے محسوس کرلیا کہ میری آنکھوں میں اُس کے لِیے نفرت کے سِوا کچھ نہیں ہے۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ قریب بیٹھے ہوئے لوگ بھی اُسے اچھّی نظر سے نہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ شرمندہ سا ہو کر اُٹھ گیا اور بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے چل دیا۔ اُس کے اِس انداز کو دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور شرمندگی بھی۔ لیکن جب اُس کا اِجازت کے بغیر اخبار اُٹھا کر پڑھنا اور چائے پینے کا انداز یاد آیا تو میرے دل میں اُس کے لِیے نفرت کے سِوا کچھ باقی نہ رہا۔

کچھ دن پہلے میں شہر سے تبدیل ہو کر اِس قصبے کے ڈاک خانے میں پوسٹ ماسٹر لگا تھا اور مجھے سزا کے طور پر اِس دُور دراز قصبے میں بھیجا گیا تھا۔ کیوں کہ بدقسمتی سے مُجھ میں اِیمان داری کے جراثیم بہُت ہیں اور بے اِیمانی تو میں برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ اِسی لِیے میرے افسروں نے

ناراض ہو کر مجھے یہاں بھیج دیا تھا۔

یہ قصبہ اہم تجاتی مرکز ہے اور ڈاک خانے کے علاوہ یہاں ایک بینک بھی ہے۔ بہت سے لوگوں نے بینک اور ڈاک خانے میں اپنے اکاؤنٹ کھول رکھے تھے۔ ہر ماہ لاکھوں کا لین دین ہوتا تھا۔ میں نے آتے ہی دن رات محنت کر کے ریکارڈ کو اوّل سے آخر تک چیک کیا۔ یہ میرا اُصول ہے کہ پہلے سب حسابات مکمّل کرتا ہوں' پھر کام شروع کرتا ہوں۔ بظاہر تو حسابات بالکل ٹھیک نظر آرہے تھے' لیکن میرے دل میں کسی بڑی گڑبڑ کا اِحساس اُبھر رہا تھا۔ چُناں چہ میں نے تین دن اِس چھان بین میں لگا دیے۔ تب مجھے پتا چلا کہ حساب میں لاکھوں کا ہیر پھیر ہے۔

میں نے اچھی طرح تسلّی کر کے کیشیئر امین اور نائب پوسٹ ماسٹر اکرم کو بُلایا۔ یہی اُن تمام مُعاملات کے ذمّے دار تھے۔ یہاں کئی ماہ سے پوسٹ ماسٹر کی سیٹ خالی تھی اور اِسی دوران میں اُنھوں نے یہ گھپلا کیا ہوگا۔ امین اور اکرم ایک ساتھ اندر آئے۔ دونوں شکل سے ہی بڑے شرارتی اور بگڑے ہوئے نظر آتے تھے۔ اندر آتے ہی وہ بغیر اِجازت میرے سامنے کُرسیوں پر بیٹھ گئے۔ شاید اُن کے ذہن میں بھی یہ بات آچکی تھی کہ میں نے اُنھیں کس لیے طلب کیا ہے۔ یہ اُن کی دیدہ دِلیری کی اِنتہا تھی۔

"اکرم صاحب' یہ رجسٹر دیکھے آپ نے؟" میں نے میز پر پڑے رجسٹروں کی طرف اِشارہ کیا۔

"اِنھیں تو روزانہ ہی دیکھتے ہیں' سر" اکرم نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"پھر تو مجھے یہ بتانے کی زحمت نہیں کرنی پڑے گی کہ اِن رجسٹروں اور ریکارڈ کے مُطابق لاکھوں روپے کا ہیر پھیر ہو چکا ہے"۔

"جی سر' ہم جانتے ہیں" امین نے دانت نکال کر کہا۔

"شٹ اَپ!" میں نے اُسے جھڑکا "لاکھوں کا غبن کر کے بھی اِتنی دیدہ دِلیری کا مُظاہرہ کر رہے ہو؟.... میں تمھیں پولیس کے حوالے کر دوں گا"۔

"پولیس یہ مسئلہ حل نہیں کر سکتی' سر" اکرم نے سنجیدگی سے کہا "اُسی کے تعاوُن سے تو ہمارا کام چلتا ہے"۔

"اوہ! اب سمجھا' تمھاری بے خوفی کی وجہ" میں نے بات کی تہ تک پہنچ کر کہا۔ وہ یقیناً پولیس کو بھی پیسے دیتے رہے تھے۔

"جی' سر۔ بہتر تو یہی ہے کہ آپ بھی ہم سے تعاوُن کریں" اکرم نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"ورنہ کیا ہوگا؟" میں نے اپنے آپ پر قابُو پاتے ہوئے کہا۔

"پولیس آپ ہی کو غبن کے اِلزام میں پکڑ لے گی" امین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

عام طور پر مجھے اِتنا غُصّہ نہیں آتا جتنا اُس وقت آیا۔ دل تو چاہا کہ ابھی فون کر کے پولیس کو بُلاؤں اور اِن دھوکے بازوں کو گرفتار کروا دوں، لیکن صورتِ حال کا تقاضا تھا کہ مُعاملے کو ٹھنڈے دل و دماغ سے حل کیا جائے۔ چُناں چہ میں نے کہا:

"ٹھیک ہے، تم لوگ جاؤ۔ میں تمہاری پیش کش پر غور کروں گا"۔

"بہتر، سر۔ آپ ہمیں اپنا خادِم پائیں گے" اکرم نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

اُن کے باہر جانے کے بعد میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اُن کے کہنے کے مُطابق پولیس بھی اُن کے ساتھ تھی۔ لیکن ساری پولیس تو اُن کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ پولیس میں اچھّے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ اور میں نے اِن اچھّے لوگوں کا کھوج لگانے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے اِس بات کی ضرورت تھی کہ غبن کے ٹھوس ثبوُت تیاّر کیے جائیں۔ چُناں چہ میں نے اِن لوگوں کے خلاف فائل بنانا شروع کر دی۔ دو دن بعد فائل تیاّر تھی۔ اب مسئلہ کسی ایمان دار پولیس افسر تک پہنچنے کا تھا۔ میں دفتر میں بیٹھا اِنہی سوچوں میں گُم تھا کہ دس بارہ سال کا ایک لڑکا اندر آیا اور مجھے ایک چِٹ دے گیا۔ میں نے اُسے کھول کر دیکھا۔ ٹوٹی پھوٹی سی لکھائی تھی، جیسے کسی تیسری جماعت کے بچّے نے لکھی ہو۔ لکھا تھا:

"صاحِب، مہربانی ہوگی اگر چند منٹ کے لیے اِس لڑکے کے ساتھ آکر مجُھ سے مِل لیں" دلاور۔

دلاور کو میں اُس وقت تک نام سے نہیں جانتا تھا۔ پھر بھی میں خاموشی سے بِلا جِھجک لڑکے کے ساتھ چل دیا۔ وہ مجھے تھوڑی دُور ایک پارک میں لے گیا۔ اور وہاں جو دلاور میرے سامنے آیا، وہ وہی شخص تھا جو اُس دن ٹی ہاؤس میں میری میز پر آ بیٹھا تھا اور جس کی حرکتوں کی وجہ سے مجھے اُس سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔ اُسے دیکھ کر مجھے دھچکا سا لگا اور غُصّہ بھی آیا کہ میں اِس گھٹیا آدمی کے ایک ذرا سے رُقعے پر چلا آیا۔ لیکن اِس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ بول اُٹھا:

"صاحِب، آپ کو اِس طرح بُلانے کی مُعافی چاہتا ہوں"۔

اُس کے مُنہ سے نکلنے والا یہ شائستہ فِقرہ مجھے حیران کر گیا اور میرے دل میں اُس کے لیے نفرت کچھ کم ہو گئی۔ میں نے بھی نرمی سے کہا "کوئی بات نہیں۔ کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"صاحِب، سُنا ہے آپ بڑے ایمان دار اور سخت افسر ہیں"۔

"تمہیں یہ کس نے بتایا؟ تم سے تو میرا کوئی واسطہ نہیں پڑا" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بس' صاحب' چند بے ایمانوں نے یہ بات مجھ تک پہنچا ہی دی" دلاور کی آواز میں افسوس تھا۔

"میں سمجھا نہیں تمہاری بات؟"

"کچھ لوگوں کو آپ کی ایمان داری سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے--- اس لیے انہوں نے آپ کو پھنسانے کا منصوبہ بنایا ہے"۔

"کیسا منصوبہ؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

دلاور نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو روپے کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میز پر رکھ دی۔

"یہ رقم مجھے آپ کے دفتر میں چھپانے کے لیے دی گئی ہے"۔

"کیا.....؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔

"ہاں' صاحب۔ آپ کے دفتر کے دو آدمی' امین اور اکرم' میرے پاس آئے تھے"۔

"اوہ! تو یہ ان کا کام ہے" میں نے کہا اور پھر پوچھا:

"مگر تم نے یہ رقم میرے کمرے میں چھپائی کیوں نہیں اور مجھے بتا کیوں دیا؟"

"صاحب' لوگ مجھے برا آدمی سمجھتے ہیں۔ میں لاکھ برا سہی مگر اتنا برا بھی نہیں۔ میرے جیسے برے لوگ تو ہزاروں ہیں مگر آپ جیسا نیک اور ایمان دار آدمی کوئی کوئی ہوتا ہے۔ کیا نیکی کی اس روشنی کو میں ذرا سے لالچ کے لیے بجھا دوں؟ یہ مجھ سے نہیں ہوگا صاحب' نہیں ہوگا"۔ دلاور کی آواز بھرا گئی۔

میں ہکا بکا اس کا منہ تک رہا تھا۔ مجھے اپنے خیالات اور رویے پر ندامت ہو رہی تھی۔ اب وہ مجھے اکھڑ' بدمزاج یا برا آدمی نہیں' ایک معصوم فرشتہ لگ رہا تھا۔ پھر میں نے اسے ساری صورتِ حال بتائی۔ اپنی اور ان لوگوں کی گفت گو سنائی۔ یہ سب سن کر دلاور سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد بولا:

"صاحب' قصبے کے ڈی ایس پی صاحب بہت ایمان دار آدمی ہیں۔ وہ تو اس کام میں ان کے مددگار نہیں ہو سکتے۔ البتہ ایس ایچ او اور اس کا عملہ ان کی مدد کر رہا ہوگا"۔

"پھر تو ہمیں ڈی ایس پی صاحب سے ملنا ہوگا" میں نے کہا۔

"جی ہاں۔ آپ دفتر سے فائل لے آئیں تاکہ ان کو دکھا کر اپنی بات ثابت کر سکیں"۔

میں کچھ ہی دیر میں وہ فائل لے آیا۔ اکرم اور امین ان باتوں سے بے خبر تھے۔ انہیں یہ علم نہ تھا کہ وہ اپنے بچھائے ہوئے جال میں خود ہی پھنس رہے ہیں۔ ڈی ایس پی صاحب دلاور کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ہماری بات انہوں نے پوری توجہ سے سنی۔ فائل کا بھی مطالعہ کیا۔ مطمئن ہونے کے بعد انہوں نے ایس ایچ او کو فون کیا اور امین اور اکرم کو فوری طور پر گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔

میں جب ڈاک خانے واپس آیا تو دلاور میرے ساتھ تھا۔ میں سارے راستے اسے یہی سمجھاتا آیا تھا کہ وہ برے کام بالکل چھوڑ دے۔

"تو اور کیا کروں' صاحب؟" اس نے پوچھا۔

"نوکری کرو اور عزت کی زندگی گزارو"۔

"مجھے نوکری کون دے گا' صاحب؟" اس کے چہرے پر درد تھا۔

"میں تمہیں نوکری دوں گا--- کرو گے؟"

"کیوں نہیں' صاحب؟ باعزت زندگی گزارنے کی خواہش کسے نہیں ہوتی؟"

یوں دلاور کو میں نے دفتر میں ملازم رکھوا دیا اور اس کی زندگی کی ڈگر بدل گئی۔

بلغاریہ کی لوک کہانی

دو بھائی

احفاظُ الرحمٰن

اُلّان کے بیٹوں، گوان اور پیتیکو، کا اپنے باپ کی جائیداد پر جھگڑا ہو گیا۔ دونوں بڑا حصّہ لینا چاہتے تھے۔ پہلے تو اُنھوں نے ایک دوسرے کو سخت سُست کہا پھر بھیڑیوں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔ گاؤں کے کُتّے زور زور سے بھونکنے لگے۔ پڑوسیوں نے دوڑ کر اُنھیں الگ کیا۔ دونوں بھائی ایک دُوسرے کو خوں خوار نظروں سے گھورتے رہے۔ بوڑھے الان نے مرتے وقت اپنے بیٹوں کے لیئے ایک کوّے جیسا سیاہ گھوڑا، ایک سانپ جیسی لچک دار تلوار، ایک کمان، سُنہرے پروں والے بیس تیر اور بھورے رنگ کے دو باز چھوڑے تھے۔ یہ تھی وہ جائیداد جس پر گوان اور پیتیکو کا جھگڑا ہُوا تھا۔

"تمہیں شرم آنی چاہیئے" بھُوری ڈاڑھی والا بُوڑھا ہانو اُن کے درمیان آتا ہُوا بولا "تُم نے اپنے جھگڑے سے پورے گاؤں کو پریشان کر دیا ہے۔ ابھی تمہارے باپ کی قبر کے پھول تک نہیں مُرجھائے اور تُم اُس کی جائیداد پر لڑنے لگے۔ تمہارا باپ اُن لوگوں میں سے تھا جو کم زوروں کی حمایت کرتے ہیں۔ وہ اِنصاف کے لیے لڑتا رہا۔ اِسی وجہ سے اُس کا یہاں بڑا اثر تھا۔ اُس نے کتنے ہی غریبوں کی مدد کی تھی۔ اُس نے جو نام چھوڑا ہے، وہ دُنیا کے تمام خزانوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ جاؤ اور کسی جگہ جا کر ٹھنڈے دِل سے غور کرو تاکہ تمہارے ذہن صاف ہو جائیں اور تم یہ بات سمجھنے لگو کہ تم ایک دوسرے کے بھائی ہو"۔

اُلّان کے بیٹوں کے سر جُھک گئے۔ بڑا بھائی گوان سیاہ گھوڑے پر سوار ہو کر اُن کھیتوں کی طرف چلا گیا جہاں جاڑوں کے موسم میں کاشت کی جاتی تھی۔ کھیتوں کو پار کر کے وہ شاہ بلوط کے گھنے جنگل میں داخل ہُوا اور ایک کنُویں کے پاس رُک گیا جس پر کائی جمی ہوئی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے سے اُتر گیا اور اُسے گھاس چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اُس نے ایک چشمے پر جُھک کر جی بھر کے پانی پیا اور شاہ بلوط کے ایک پُرانے درخت کی ٹیڑھی میڑھی شاخ سے ٹیک لگا کر نیچے زمین کی طرف دیکھنے لگا۔

گھنے پودوں کے درمیان ایک بہت تنگ راستہ بنا ہُوا تھا اور اُس پر ایک چیونٹی رینگ رہی تھی۔ وہ باجرے کا ایک دانہ لُڑھکا کر لے جا رہی تھی جو بُلبُل کی آنکھ جتنا تھا۔ اچانک دانہ ایک گڑھے میں گر گیا۔ چیونٹی اُسے نکالنے کی کوشش کرنے لگی اور جب تھک گئی تو اُسے چھوڑ کر اپنے گھر کی طرف چلی گئی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی اور گڑھے کی طرف رینگنے لگی۔ اُس کے پیچھے ایک دوسری چیونٹی بھی تھی جو شاید اُس کی بہن تھی۔ دونوں گڑھے میں اُتر گئیں اور جان توڑ محنت کر کے دانہ اُوپر نکال لائیں۔

اب وہ اُسے لُڑھکاتی ہُوئی اپنے گھر کی طرف جا رہی تھیں۔ گوان بڑی دیر تک اِن ننھّی مُنّی چیونٹیوں کو دیکھتا رہا۔ اچانک اُس کے ذہن میں ایک روشنی سی ہوئی اور اُس کی آنکھوں سے خود غرضی کا پردہ ہٹ گیا۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ چھوٹے بھائی پیتیکو نے کیا کیا۔ جب اُس نے یہ دیکھا کہ اُس کا بڑا بھائی گھوڑے پر

سوار ہو کر کہیں چلا گیا ہے تو وہ بھی دونوں باز لے کر چراگاہ کی طرف چل پڑا۔

چراگاہ کی لمبی لمبی گھاس سرسرا رہی تھی اور اُس پر بُہت سی تِتلیاں منڈلا رہی تھیں۔ آسمان نیلا اور روشن تھا۔ اُوپر ایک سفید رنگ کا عُقاب اِدھر اُدھر چکّر لگا رہا تھا' اِس اُمّید پر کہ بھیڑ کا کوئی بچّہ اپنے ریوڑ سے الگ ہو اور وہ اُسے دبوچ کر اپنے بھوکے بچّوں کے پاس لے جائے۔ پیتکو کی نظر عُقاب پر پڑی تو اُس نے اُس پر اپنا باز چھوڑ دیا۔ بہادُر پرندہ تیر کی طرح اُڑتا چلا گیا اور دیکھتے دیکھتے عُقاب کے پاس پہنچ گیا۔ دونوں شکاری پرندوں میں ایک خوف ناک لڑائی شروع ہوگئی اور اُن کے پر ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرنے لگے۔ اچانک باز نے مدد کے لیے چیخ ماری۔ پیتکو نے جب یہ دیکھا کہ اُس کا پرندہ خطرے میں ہے تو اُس نے دوسرے باز کو بھی اُڑا دیا اور اُن دونوں نے عُقاب کو بُری طرح زخمی کر دیا۔

اچانک عُقاب نے مایُوس ہو کر ایک چیخ ماری اور بھاگنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن دونوں باز اُس پر جھپٹ پڑے اور اُسے نیچے زمین پر لے آئے۔ عُقاب پتّھر کی طرح زمین پر آگرا۔ آخری سانس لینے سے پہلے اُس نے سامنے پہاڑ کی طرف دیکھا جہاں اُس کے چھوٹے چھوٹے بچّے اُس کا اِنتظار کر رہے تھے۔ یُوں معلوم ہُوا جیسے اُس کی آنکھیں کہہ رہی ہوں کہ اگر میرا بھی کوئی بھائی ہوتا تو وہ ضرور میری مدد کرتا۔

پیتکو نے اپنے بازوں کو شاباش دینے کے لیے اُن پر ہاتھ پھیرا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ اب یہ بات اُس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ اگر اِس دُنیا میں تمہارا کوئی بھائی نہیں ہے تو تمہیں چاہیے کہ کہیں سے اپنا بھائی تلاش کرلو۔

پیتکو جب اپنے گھر کے اِحاطے میں داخِل ہُوا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کا بھائی بھُوسے کے ڈھیر پر بیٹھا اُس کا اِنتظار کر رہا ہے۔ پیتکو نے اُس سے کہا:

"میں نے جو بُرے الفاظ کہے ہیں اُن کے لیے مُعافی چاہتا ہُوں' بھیّا۔ ابّا نے جو کچھ چھوڑا ہے وہ تم لے لو' لیکن مُجھ سے ناراض نہ ہو"۔

یہ کہہ کر اُس نے اپنے بھائی کے ہاتھ چُوم لیے۔ گوان نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ہم اب کبھی نہیں لڑیں گے۔ دونوں ساتھ ساتھ رہیں گے' ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور اپنی تمام آمدنی آپس میں بانٹ لیا کریں گے"۔

اپنی حماقت آزمائیے

یہ آپ کی حماقت یعنی بے وقوفی کا اِمتحان ہے۔ اگر آپ واقعی ایک اچھّے احمق ہیں تو پھر آپ اِس اِمتحان میں کام یاب ہو جائیں گے۔ لیکن اپنے آپ کو 100 فی صد نمبر دینے سے پہلے سوالوں کے جواب ضرور دیکھ لیں۔ اچھّا تو بتائیے:

1- رات کیسے شروع ہوتی ہے؟
2- کیا آپ سُرخ روشنائی سے نیلا لکھ سکتے ہیں؟
3- وہ کیا شے ہے جو ہے تو آپ کی لیکن اُسے آپ سے زیادہ دوسرے اِستعمال کرتے ہیں؟
4- وہ کیا چیز ہے جس کے پَر نہیں مگر وہ بُہت تیز اُڑتی ہے؟
5- وہ کس کی گردن ہے جسے توڑنے سے عموماً آپ کو سزا نہیں مِلتی؟
6- ایک جُوتے کے ساتھ دوسری کیا چیز ہوتی ہے؟
7- ایک خالی پیٹ پہلوان کتنے انڈے کھا سکتا ہے؟

ایک لڑکی کھانا پکانے کا اِمتحان دے کر آئی۔ اپنی پکائی ہوئی فرنی کی دیر تک تعریف کر چکی تو اُس کی ماں نے پُوچھا "تمہاری لذیذ فرنی اُستانیوں نے خود ہی کھالی یا تمہیں بھی کھانے کو دی؟"

"کھانے کو دی؟" لڑکی نے کہا "امّی، اُنہوں نے مجھے زبردستی کھلائی"۔

اُستاد: قائدِاعظم کس سن میں پیدا ہوئے تھے؟"

شاگرد: جناب، 1876ء میں۔

اُستاد: خوب! اور 1885ء میں کیا خاص واقعہ پیش آیا تھا؟

شاگرد: جناب قائدِاعظم 9 برس کے ہوگئے تھے۔

"مُحترمہ، آپ مُطمئن رہیں۔ میں بہت اچھا کرائے دار ثابت ہوں گا۔ اور آپ کو کیا بتاؤں، جو مکان میں چھوڑ کر آیا ہُوں، اُس کا مالک میرے مکان چھوڑنے پر زار و قطار رو رہا تھا" نئے کرائے دار نے ایک خاتون کا مکان کرائے پر لینے کے لیے بات چیت ختم کرتے ہوئے کہا۔

"خیر، یہاں ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ میں اپنے مکان کا کرایہ پیشگی وصول کرلیتی ہُوں" خاتون نے جواب دیا۔

پولیس اِنسپکٹر: بیگم صاحبہ، جب صبح کو آپ کی آنکھ کُھلی اور آپ نے دیکھا کہ گھر کا سارا سامان تلپٹ ہے، کپڑے اِدھر اُدھر بکھرے ہُوئے ہیں، میزوں کی درازیں اُلٹی ہُوئی ہیں تو اُس وقت آپ نے یہ سوچا کہ گھر میں چور گھُس آئے ہیں؟

بیگم صاحبہ: جی نہیں۔ میں سمجھی میرے میاں اپنی ٹائی تلاش کر رہے ہیں"۔ (سُہیل احمد سعید، فیصل آباد)۔

ایک صاحب نے پنکھا لگانے کے لیے اپنے کنجوس پڑوسی سے سیڑھی مانگی۔ پڑوسی نے جواب دیا "سیڑھی دینے میں مجھے کچھ اِعتراض نہیں۔ مگر میری بیگم صندوق میں سیڑھی رکھ کر تالا لگا گئی ہیں۔ (نازیہ گل، راول پنڈی)

مُلازمت کے اُمیدوار سے کمپنی کے ڈائریکٹر نے کہا "آپ کے پاس پچھلی جگہوں کے سرٹیفکیٹ ہیں؟

اُمیدوار بولا "نہیں، جناب۔ میں نے سب کے سب پھاڑ کر پھینک دیے ہیں"۔

ڈائریکٹر نے کہا "یہ تو آپ نے بڑی بے وقوفی کی"۔

اُمیدوار نے جواب دیا "اگر آپ نے اُنہیں پڑھ لیا ہوتا تو آپ کی یہ رائے نہ ہوتی۔ (محمّد سعید رضا خاکوانی، بورے والہ)۔

ایک آدمی کے پاس مختلف رنگوں کے طوطے تھے۔ اُن میں سے سبز اور سُرخ رنگ کے طوطے اُڑ گئے اور پاگل خانے کے پاس ایک درخت پر بیٹھ گئے۔

ایک شخص نے ایک پاگل کو بھیجا کہ اِن کو اُتار لاؤ۔ وہ گیا اور سُرخ طوطا پکڑ لایا۔ اُس شخص نے پُوچھا "دوسرا کیوں نہیں لائے؟۔

پاگل نے کہا "جب وہ بھی پک کر سُرخ ہو جائے گا تو پکڑ لاؤں گا۔ (فضل بادشاہ، پشتون گڑھی پشاور)۔

اُستاد: (عامر سے): اگر تم مغرب کی طرف مُنہ کر کے کھڑے ہو جاؤ تو تمہارے بائیں ہاتھ پر کیا ہوگا؟

عامر: جناب، چار اُنگلیاں اور ایک انگوٹھا۔ (بُرہان احمد مُغل، فیصل آباد)

آپ بھی لکھیں

زندگی کے میلے

کاشف ریاض، لاہور

"ثاقب، ثاقب، کل شام کو میلے میں نہیں چلو گے؟" اعجاز نے سائیکل سے اُترتے ہوئے کہا۔ اُس وقت وہ آدھی آستین کی قمیص اور سفید نیکر پہنے ہوئے تھا کیوں کہ وہ ہاکی کھیل کر آ رہا تھا۔

"بھئی، دل تو میرا بہت چاہ رہا ہے لیکن کیا کروں، میرے پاس پیسے نہیں ہیں"۔

ثاقب اُداس لہجے میں بولا۔ اُس کے ہاتھ میں کاپی اور قلم تھا اور وہ ٹیوشن پڑھ کر آ رہا تھا۔

"تو پھر تم میلے میں نہیں جاؤ گے؟" اعجاز نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"ہاں، مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے ساتھ میلے میں نہ جا سکوں گا" ثاقب نے سر جُھکا کر بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"تو اِس میں دل چھوٹا کرنے کی کیا بات ہے؟ تم اپنے گھر والوں سے پیسے لے لینا" اعجاز نے اُس کی ہمّت بندھائی۔

"گھر والے پیسے نہیں دیں گے۔ آج کل میرا جیب خرچ بالکل بند ہے۔ تمہیں تو پتا ہی ہے، ششماہی امتحان میں کم نمبر لانے پر ابّاجان سخت خفا ہوئے تھے، اور اُنہوں نے میرا جیب خرچ اُس وقت تک کے لیے بند کر دیا ہے جب تک میں سالانہ امتحان میں اچھّی کام یابی حاصل نہیں کرلیتا" ثاقب نے افسُردہ لہجے میں اعجاز کو بتایا۔

"حیرت ہے! اتنی سی بات پر تمہارے ابّاجان نے تمہارا جیب خرچ بند کر دیا" اعجاز نے مُنہ بناتے ہوئے کہا۔ وہ چند لمحے کچھ سوچتا رہا۔ اِس کے بعد بولا "تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ تم میلے میں نہیں جا سکتے؟"

"ہاں۔ مجبوری ہے" ثاقب بولا۔

"ویسے تم ایک طریقے سے پیسے حاصل کر سکتے ہو" اعجاز نے ثاقب کے قریب مُنہ لے جا کر آہستہ سے کہا۔

"کس طریقے سے؟" ثاقب نے حیرت سے پُوچھا"۔

"تم ابّاجان کے بٹوے میں سے کچھ پیسے نکال لینا" اعجاز سرگوشی میں بولا۔

"نن..... نن..... نہیں۔ یہ تو چوری ہوئی، اور چوری میں نہیں کر سکتا" ثاقب نے گھبرا کر کہا۔

"اگر تم افریقہ کے سفید بندر، آسٹریلیا کے طوطے اور ڈولفن مچھلی کے دل فریب کرتب نہیں دیکھنا چاہتے تو تمہاری مرضی۔ اچھّا، خدا حافظ۔ میں تو چلا" اعجاز نے سائیکل پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ پھر اُس نے گردن موڑتے ہوئے کہا "میری بات اگر تمہاری سمجھ میں آجائے تو میں کل شام تمہارا انتظار کروں گا" اتنا کہہ کر وہ سائیکل چلاتا ہُوا نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

ثاقب گھر آیا تو اُس کا ذہن اُلجھا ہُوا تھا۔ دل کہتا تھا کہ اعجاز کی بات مان لو جب کہ دماغ کہتا تھا کہ نہیں، یہ بُری بات ہے۔ جو چوری کرتا ہے وہ خدا کی نافرمانی کرتا ہے۔

رات بھر ثاقب کے دِل و دماغ میں جنگ ہوتی رہی۔ آخر اُس کے اندر کی سچّائی جیت گئی اور اُس نے اپنے امّی ابّو کو اعجاز کی باتیں بتا دیں۔ جب وہ یہ باتیں بتا رہا تھا تو اُس کی آنکھیں جھکی ہُوئی تھیں۔

"ابّو، مجھے مُعاف کر دیجیے۔ میں آیندہ اِعجاز جیسے دوست نہیں بناؤں گا۔ اُس نے مجھے بُری بات کی ترغیب دی تھی۔ وہ میرا اچھّا دوست نہیں ہے" وہ ابّو کے گلے لگتے ہوئے بولا۔

"شکر ہے کہ خدا نے تمہاری آنکھیں کھول دیں اور تم نے اچھّے اور بُرے دوست کی پہچان کرلی" ابّو شفقت بھرے لہجے میں بولے۔

"ابّو، آپ نے مجھے مُعاف کر دیا ناں؟"

"ہاں، بیٹا۔ تم نے ساری بات بتا کر مجھے خوش کر دیا ہے دیکھو، بیٹے۔ زندگی بھی ایک میلا ہی ہے۔ اِس میلے میں نیکی اور بدی ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کچھ لوگ نیکی کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگ بدی کے ساتھ۔ جو ایک دفعہ زندگی کی رنگینیوں میں کھو جاتا ہے، وہ اپنے خدا کو بھول جاتا ہے، دُنیا میں اپنے آنے کے مقصد کو فراموش کر دیتا ہے اور بدی کا ساتھ دینے لگتا ہے۔ جب کہ نیکی کی راہ پر چلنے والے دوسرے لوگوں کو بھی بُرائیوں سے بچاتے ہوئے آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ وہ ہر قسم کی مُشکلات اور مُصیبتوں کا مردانہ وار مُقابلہ کرتے ہیں۔ زندگی کا مقصد بھی یہی ہے کہ خود بھی بُرائی سے بچا جائے اور دوسروں کو بھی اِس سے بچایا جائے"۔

ابّو کے خاموش ہوتے ہی ثاقب مضبوط لہجے میں بولا:

"ابّو، میں نیکی کا ساتھ دوں گا۔ ابّو، زندگی کے میلے میں میرا ہر قدم بُرائی سے بچتے اور دُوسروں کو بچاتے ہوئے آگے بڑھے گا۔ میں حق کی روشنی اور سچّائی کا اُجالا بنوں گا"۔

نئے دن کا سورج چاروں طرف نئی کرنیں بکھیر رہا تھا۔ ایسی ہی کرنیں ثاقب کے اندر سے بھی پھوٹ رہی تھیں۔ نئے جذبوں، نئے، حوصلوں اور ایک نئے عزم کے ساتھ۔

(پہلا اِنعام: 50 روپے کی کتابیں)

ضمیر کا فیصلہ

نعیم افضل، اِسلام آباد

صبح سویرے، فجر کی نماز کے بعد، سیر کے لیے جانا راشد کا معمول تھا۔ آج بھی وہ صبح سویرے بیدار ہُوا، وُضو کر کے نماز ادا کی اور سیر کے لیے چل پڑا۔ موسم خاصا خوش گوار تھا۔ وہ قدرت کی رنگینیوں سے لُطف اندوز ہوتا ہوا ایک سڑک پر ہولیا۔ اُس سے تھوڑا آگے ایک بوڑھا آدمی جا رہا تھا۔ غالباً وہ بھی سیر کر رہا تھا۔ اچانک پیچھے سے کسی گاڑی کے ہارن کی آواز سُنائی دی۔ راشد نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو سفید رنگ کی ایک کار بڑی تیزی سے آ رہی تھی۔ وہ سڑک سے اُتر کر کار کے گزرنے کا اِنتظار کرنے لگا۔

جُوں ہی کار اُس کے پاس سے گزری، وہ چونک اُٹھا کیوں کہ وہ اِس کار کو پہچانتا تھا۔ کار اُس کارخانے کے مالک سیٹھ ہاشم کی تھی جس میں راشد کام کرتا تھا۔ اُس وقت کار سیٹھ ہاشم کا اِکلوتا بیٹا سلیم چلا رہا تھا اور اُس نے رفتار خطرناک حد تک تیز کر رکھی تھی۔

بوڑھے آدمی نے ہارن کی آواز نہیں سُنی تھی اور وہ اپنی دُھن میں مست چلا جا رہا تھا کہ اچانک کار لہرائی اور بے قابو ہو کر بوڑھے سے جا ٹکرائی۔ وہ سڑک پر گر پڑا اور اُس کے سر سے خون بہنے لگا۔ سلیم نے کار اور تیز کر دی اور چند ہی لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

راشد بھاگ کر بوڑھے کے پاس پہنچا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا اور اُس کے سر سے خون بہ رہا تھا۔ سامنے سے ایک اور کار آ رہی تھی۔ راشد نے ہاتھ کے اِشارے سے اُسے روکا اور بوڑھے کو اُس میں ڈال کر ہسپتال لے گیا۔ ڈاکٹروں نے مریض کی حالت دیکھ کر پولیس کو اِطّلاع دی۔ جلد ہی ایک اِنسپکٹر تفتیش کے لیے پہنچ گیا۔ اِسی دوران میں بوڑھا زخموں کی تاب نہ لا کر دم توڑ گیا۔ اِنسپکٹر نے ایکسی

ڈنٹ کا مُقدّمہ درج کر کے راشد کا بیان لیا۔ اُس نے اپنے بیان میں نہ صرف حادثے کی تفصیلات بتائیں بلکہ کار کا نمبر اور مالک کا نام بھی بتا دیا۔

شام کے وقت راشد گھر میں بیٹھا اِسی حادثے کے مُتعلّق سوچ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اُس نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے سیٹھ ہاشم کو کھڑا دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"سیٹھ صاحِب، آپ؟" اُس نے حیرت سے کہا۔

"مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں" سیٹھ ہاشم نے کہا۔

"تشریف لائیے" یہ کہہ کر وہ سیٹھ ہاشم کو ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

"میرا وقت بہُت قیمتی ہے۔ میں مطلب کی بات کرنا چاہتا ہوں" سیٹھ ہاشم نے بیٹھے ہوئے کہا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج تم نے پولیس کو میرے بیٹے کے خلاف بیان دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنا بیان بدل دو اور میرے بیٹے کا نام مت لو۔ دوسری صورت میں تمہیں نوکری سے ہاتھ دھونا پڑیں گے"۔

راشد سوچنے لگا کہ وہ جھوٹ بول کر اپنی نوکری بچائے یا سچ پر قائم رہ کر خدا کی خُوش نُودی حاصل کرے؟

اچانک اُس کے اندر سے ضمیر کی آواز اُبھری "راشِد! تم مسلمان ہو۔ کیا تم بھول گئے ہو کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ گواہی مت چُھپاؤ۔ گواہی کو چُھپانے والا گُناہ گار ہوتا ہے۔ اگر تم نے دنیا کی خوشی کے لِیے خدا تعالیٰ کے فرمان پر عمل نہ کیا تو تم پر اُس کا قہر نازِل ہو گا"۔

اُس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اپنا بیان نہیں بدلے گا اور اپنے اِس فیصلے سے اُس نے سیٹھ ہاشم کو آگاہ کر دیا۔ سیٹھ ہاشم نے فوراً اُسے نوکری سے نکال دیا اور دھمکی دے کر چلے گئے۔ راشد کو نوکری جانے کا کوئی غم نہ تھا۔ اُس کے دل کو یہ اِطمینان تھا کہ اُس نے خدا تعالیٰ کے حکم پر عمل کیا ہے اور وہ اُس کے رِزق کا سامان کر دے گا کیوں کہ وہی سب کا رازِق ہے۔ (دُوسرا انعام: 45 روپے کی کتابیں)

ناقابِل فراموش

مُنیر احمد فردوس، ڈیرہ اِسماعیل خان

یہ آج سے دو سال پہلے کا واقِعہ ہے۔ ہم چند دوست سیر و تفریح کی غرض سے لاہور گئے۔ ایک روز ہم گھومنے پھرنے کے بعد اپنی رہائش گاہ کی طرف لوٹ رہے تھے اور تمام دوست خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

جس راستے سے ہم واپس آ رہے تھے وہ کچھ سُنسان سا تھا۔ شام کا اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا اِس لِیے ہمارے قدم تیزی سے اُٹھ رہے تھے کہ اچانک میری نظر سامنے سے آتے ہوئے ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکے پر پڑی۔ اُسے دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ اُس کے دونوں ہاتھوں میں سِگرٹ تھے اور وہ ایک کش ایک سگرٹ کا لیتا اور دوسرا کش دوسرے سگرٹ کا۔

میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ پتا نہیں یہ کس ماں کے جِگر کا ٹُکڑا ہو گا جو اِتنی کم عُمری میں غلط راہ پر چل نکلا ہے۔

ہم تھوڑی دیر پہلے خوش گپیوں میں مصروف تھے، اب ہم پر سکتہ طاری ہو چکا تھا۔ ہماری نظریں برابر اُس لڑکے پر جمی ہوئی تھیں جو سگرٹ پینے میں بُری طرح غرق تھا۔

تھوڑی دُور آگے جاکر وہ لڑکا فُٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے ایک بھکاری کی طرف تیر کی طرح لپکا۔ اُس بھکاری نے ایک بڑی سی چادر اپنے سامنے پھیلا رکھی تھی، جس پر چند چھوٹے نوٹ پڑے تھے۔ لڑکے نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جب جیب سے ہاتھ نکالا تو اُس کے ہاتھ میں کچھ نوٹ دبے ہوئے تھے۔ اُس نے نوٹ اُس بھکاری کو دے دِیے۔ بھکاری نے نوٹ گِنے اور اپنی جیب میں ڈال لِیے۔ پھر اپنے سامنے بچھی ہُوئی چادر کے ایک کونے کو اُٹھا کر اُس کے نیچے سے ایک چھوٹی سی پُڑیا نکالی اور جلدی سے اُس لڑکے

کو تھما دی۔

یہ دیکھ کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور میں بُت بنا اُسے دیکھتا رہا۔ جب میں سنبھلا تو وہ لڑکا وہاں سے اُٹھ کر واپس جا چکا تھا اور بھکاری ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگ رہا تھا۔

پتا نہیں ایسے کتنے شیطان ہمارے ملک میں پھیلے ہوئے ہوں گے جو معصوم نوجوانوں کے مُستقبل کو تباہ کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ کوئی بھی ایسا نہیں جو ملک سے اِن کا خاتمہ کر سکے اور ہمارے نوجوانوں کو نشے کی لعنت سے چُھٹکارا دلا سکے۔ روزانہ پتا نہیں کتنے نوجوان اِس لعنت کی بھینٹ چڑھ جاتے ہوں گے۔ آخر اِس کا ذمّے دار کون ہے؟

(تیسرا اِنعام: 40 روپے کی کتابیں)

کارنامہ

محمّد سلیم اعوان، گاؤں پوٹہ (ڈیرہ اِسماعیل خان)

"ابّو، میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا، مُجرموں کو پکڑنے کے لیے" ساجد نے اپنے ابّو سے ضِد کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، بیٹے۔ وہ بہُت خطرناک لوگ ہیں۔ میں تُمھیں ساتھ نہیں لے جا سکتا" ساجد کے ابّو اِنسپکٹر عِرفان نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

ساجد نویں جماعت کا طالبِ علم تھا۔ اُس کے ابّو پولیس میں اِنسپکٹر تھے اور کافی مشہور تھے، کیوں کہ اُنھوں نے نہایت بہادُری سے کئی ڈاکوؤں اور مُلک دُشمنوں کو گرفتار کیا تھا۔ ساجد اپنے ابّو کے ساتھ کئی دفعہ اِس قسم کی مُہمّوں میں گیا تھا۔ لیکن اُس کا کام صرف تماشا دیکھنا تھا۔ اِس بار بھی اُس کے ابّو مُجرموں کے ایک کیس پر کام کر رہے تھے اور اُنھیں کافی محنت کے بعد مُجرموں کا سُراغ ملا تھا۔ یہ مجرم بہُت خطرناک تھے۔ وہ شہر میں بم دھماکے، قتل، اِغوا اور دوسرے جرائم کرتے تھے۔ اِس لیے اِنسپکٹر عِرفان نے یہ کیس خود لیا تھا۔ مُجرموں نے شہر سے 30 کلو میٹر دور جیوانی جنگل میں اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا ہوا تھا۔

اِنسپکٹر عرفان کو اگلے روز آپریشن کے لیے جانا تھا۔ جب اُنھوں نے اپنی بیگم کو بتایا تو ساجد نے بھی سُن لیا اور ضِد کرنے لگا کہ وہ بھی ساتھ جائے گا۔ انسپکٹر عرفان کے خیال میں مُجرم بہُت خطرناک تھے۔ اِس لیے پہلے تو اُنھوں نے ساجد کو منع کیا، لیکن جب اُس نے بہُت ضِد کی تو اُنھوں نے اُسے ساتھ لے جانے کی ہامی بھرلی۔

پھر دوسرے دن، صبح کے دس بجے کے قریب، پولیس کی تین جیپیں اِنتہائی تیز رفتاری سے شہر کے باہر جیوانی جنگل کی طرف دوڑی چلی جا رہی تھیں۔ ساجد، اُس کے ابّو اور چند دوسرے افسر آگے والی جیپ میں سوار تھے۔ جنگل سے کچھ فاصلے پر اِنسپکٹر نے جیپ رُکوا دی۔ اُس کے ساتھ ہی پیچھے آنے والی جیپیں بھی رُک گئیں، اور پھر انسپکٹر کے حکم پر سپاہی جیپوں سے باہر آنے شروع ہوگئے۔ اُن کی تعداد چالیس کے قریب ہوگی۔ اِنسپکٹر کی ہدایت پر دس دس کی ٹولیاں بن گئیں اور ہر ٹولی میں جنگل کا ایک ایک حِصّہ تقسیم کر دیا گیا۔ سپاہی رائفلیں لیے آگے بڑھنے لگے۔

اچانک جنگل میں سے فائرنگ کی آوازیں آنی شروع ہوگئیں۔ انسپکٹر عرفان نے بھی فائرنگ کا حکم دیا اور خود بھی فائر کرتے ہوئے جنگل کے اندر داخل ہوگئے۔ ساجد کچھ دیر تو اُن کے ساتھ رہا، پھر وہ دائیں طرف ایک جھاڑی کے پیچھے چُھپ گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک دونوں طرف سے فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہا۔ پھر اچانک ایک آواز سُنائی دی "اِنسپکٹر! اپنے سپاہیوں سے کہو کہ ہتھیار پھینک کر ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ نہیں تو میں تمہاری کھوپڑی میں سُوراخ کر دوں گا"۔

ساجد نے اپنے دائیں طرف دیکھا تو یہ دیکھ کر اُس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں کہ ایک مُجرِم نے اُس کے والِد کے سر سے ریوالور لگا رکھا تھا۔ یہ دیکھ کر اُس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ وہ رینگتا ہوا اُس مُجرم کی پُشت کی طرف بڑھنے لگا۔

اُدھر اِنسپکٹر عِرفان کو عجیب صُورتِ حال کا سامنا تھا۔ اُن کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ ابھی وہ اِسی کش مکش میں تھے کہ ایک آواز نے اُنہیں چونکا دیا "ہینڈز اَپ!" یہ ساجد کی آواز تھی، جو مُجرِم کے سر پر پہنچ گیا تھا اور بڑی پُھرتی سے اُس کی گردن پر پستول رکھ دیا تھا۔ کچھ دیر بعد پولیس نے مُجرموں کو گرفتار کرلیا۔

اِنسپکٹر عِرفان نے ساجد کو شاباش دی اور کہا "اِس کام یابی کا سہرا تمہارے سر ہے۔ تم نے نہ صرف اپنے ابّو کی جان بچائی، بلکہ ملک کو بھی مزید نُقصان سے بچا لیا"۔ یہ کہہ کر اِنسپکٹر عرفان نے ساجد کو سینے سے لگا لیا۔

(چوتھا اِنعام : 35 روپے کی کتابیں)

پریشر ککر

نازیہ حسَن، سرگودھا

اِس واقعے کو تقریباً دو سال ہو چکے ہیں۔ اُس وقت ہم آٹھویں جماعت میں تھے اور امّی جان ہمیں گھر کے کاموں میں دِل چسپی لینے کے لِیے نصیحت کرتی رہتی تھیں۔ اُن دِنوں ہماری پھُوپھی جان شہر میں کھانسی کا عِلاج کروانے آئی ہوئی تھیں اور ہمارے ہی گھر ٹھہری ہوئی تھیں۔

ایک دن امّی جان بازار گئیں اور جاتے جاتے ہمیں نصیحت کر گئیں کہ کھانا پکا لینا اور پھوپھی جان کو آرام کرنے دینا، کیوں کہ اُنہیں کام کرتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے۔ خیر، جوں ہی امّی جان باہر نکلیں، ہم نے باورچی خانہ سنبھالا اور سب سے پہلے آٹا گوندھا، پھر چھلکوں والی ماش کی دال صاف کر کے بھگو دی۔ نمک اور مرچ ڈالنے کے لِیے پھوپھی جان کا سہارا لیا۔

ہم دیگچی چُولھے پر رکھ ہی رہے تھے کہ ہماری نظر پریشر ککر پر پڑی۔ ہم نے سوچا کہ کیوں نہ دال پریشر ککر میں پکائی جائے۔ چُناں چہ ہم نے دال پریشر ککر میں ڈال دی اور اوپر ڈھکّن دے دیا۔

اب ہم نے آگ کو تیز کیا اور جلدی جلدی گندے برتن دھونے لگے۔ برتن دھو کر ہاتھ تولیہ سے صاف کرنے کے لِیے باہر قدم رکھا تو اُسی لمحے باورچی خانے میں زبردست دھماکا ہوا۔ ہم دیوانوں کی طرح باورچی خانے کی طرف دوڑے۔ اِتنی خوف ناک آواز سُن کر ہماری ہمسائیاں بھی آگئی تھیں۔ اب ہم سب باورچی خانے کا نظارہ کر رہے تھے اور سب کے چہرے خوف سے زرد ہو رہے تھے کیوں کہ ہمارا ککر چھت سے ٹکرا کر اوپر ہی اوپر گولائی میں گھوم رہا تھا۔

ہمارے تو اوسان ہی خطا ہوگئے۔ ہم سوچنے لگے کہ پریشر ککر نیچے برتنوں پر گرا تو اِن کا کچومر نکل جائے گا۔ پھر تو امّی ہماری خوب خبر لیں گی۔ ہم دل ہی دل میں دعا کرنے لگے کہ یا اللہ! ہمارے برتن بچ جائیں۔ ہم دعا میں مصروف ہی تھے کہ ککر فضا میں پرواز کے بعد فرش پر دھڑام سے گر پڑا۔ شکر ہے کہ برتن بچ گئے۔

ہم ککر کی طرف بھاگے اور یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی کوئی اِنتہا نہ رہی کہ دال کا ایک دانہ بھی باہر نہیں گرا تھا۔

دوپہر کو جب سب گھر والے کھانا کھانے بیٹھے تو پھوپھی جان نے امّی اور ابّو کو یہ ہول ناک واقِعہ سُنایا۔ ابّو جان نے ہم سے ککر لانے کو کہا۔ ککر کے ڈھکّن کو دیکھ کر وہ سمجھ گئے اور کہنے لگے کہ اِس کے سُوراخ میں ماش کی دال کے چھلکے پھنس گئے تھے جس سے فالتو بھاپ باہر نہ نکل سکی، اور جب بھاپ زیادہ ہوگئی تو ککر دھماکے کے ساتھ چھت سے جا ٹکرایا۔ پریشر ککر میں چھلکوں والی دال اور پتّوں والی سبزی نہیں پکانی چاہیے۔ گوشت کو بھی خوب صاف کرلینا چاہیے۔

ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم عین وقت پر باورچی خانے سے باہر نکل گئے تھے۔ اگر اندر ہی ہوتے تو خدا جانے ہمارا کیا حال ہوتا۔ آج بھی یہ واقِعہ یاد آتا ہے تو ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

(پانچواں اِنعام : 30 روپے کی کتابیں)

ماں کا اِنتقام

سلیم خان گمی

یہ 1971ء کا واقعہ ہے۔ یہ وہ سال ہے جب بھارت نے سوویت یُونین کی مدد سے مشرقی پاکستان پر حملہ کیا اور مشرقی پاکستان کے کچھ لیڈروں نے بھی بھارت کا ساتھ دیا۔ اِن غدّار لیڈروں نے ایک فوج بھی تیّار کی تھی جس کو مُکتی باہنی کہتے تھے۔ اُس کو بھارت نے گولا بارود دیا تھا اور وہ بھارتی فوجوں کے ساتھ مِل کر پاک فوج سے لڑی تھی۔

1971ء کی لڑائی صرف مشرقی پاکستان میں ہی نہیں لڑی گئی، مغربی پاکستان، مقبُوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر اور بلتِستان اور لدّاخ کی سرحد پر بھی لڑی گئی تھی۔ اِس لڑائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا اور مغربی پاکستان کی تحصیل شکرگڑھ کے 484 گاؤں بھارت کے قبضے میں چلے گئے جو شملہ مُعاہدے کے بعد پاکستان کو واپس مِل گئے۔ بلتِستان کے سات دیہات پر بھی بھارتی فوج نے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ سات دیہات اب تک بھارت کے قبضے میں ہیں اور لدّاخ کا حِصّہ ہیں۔ یہ کہانی اِن سات دیہات میں سے ایک گاؤں "ترتک" کی ہے جہاں نُور دِین کا قاتِل بشیر احمد رہتا تھا۔

نور دین موضع "فرانو" کا رہنے والا تھا جو شمالی علاقہ جات کے ایک ضلع بلتِستان کا سرحدی گاؤں ہے۔ اِس گاؤں کے بعد لدّاخ کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے جو مقبُوضہ کشمیر کا حِصّہ ہے اور جس پر بھارت کا قبضہ ہے۔ 1971ء کی لڑائی میں بلتِستان کے سات دیہات بشیر احمد کی غدّاری کی وجہ سے بھارت کے قبضے میں چلے گئے تھے جو اُس نے شملہ مُعاہدے کے بعد بھی پاکستان کو واپس نہیں کیے۔

فرانو کا نُور دین اپنے گاؤں کا بہُت دِلیر شکاری تھا۔ وہ اپنا اور اپنی بوڑھی ماں کا پیٹ شکار سے پالتا تھا۔ اُس کے شِکار کیے ہوئے جانور بلتِستان کے امیر لوگ خرید لیتے تھے۔ اِن امیر لوگوں کو بلتستان میں راجا کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات راجا لوگ اُسے اپنے ساتھ شکار پر لے جاتے اور شام کو شکار کر کے واپس لوٹتے تو اُسے کچھ نقدی اور شکار کا حِصّہ دے دیتے۔ بشیر احمد بھی اُس کے گاؤں میں رہتا تھا۔ وہ آوارہ قسم کا آدمی تھا۔ اُس کے پاس ایک گھوڑا تھا جس سے وہ بار برداری کا کام لیتا تھا۔ پھر وہ ایک دن شہر گیا تو گھوڑا بیچ کر بندوق خرید لایا۔ لائسنس وہ پہلے بنوا چُکا تھا۔ یُوں وہ

بھی شکاری بن گیا اور نُور دِین کے ساتھ شکار کے لِیے جانے لگا۔ لیکن اُس کا مزاج شکاریوں والا نہ تھا۔ شکاری تو دِلیر، محنتی اور حوصلہ مند ہوتا ہے۔ لیکن یہ باتیں بشیر احمد میں نہ تھیں۔

ایک صبح نُور دین شکار کے لِیے جانے لگا تو اُس کی ماں نے پُوچھا "بیٹا، کہاں جا رہے ہو؟"

"شکار کے لِیے جا رہا ہوں۔ آپ کو پتا ہے کہ میں روزانہ شکار کو جاتا ہوں"۔

"اور تُمھیں پتا ہے کہ میں تُم سے روزانہ پُوچھتی ہوں کہ بیٹا کہاں جا رہے ہو"۔

"ہاں، ماں۔ مجھے پتا ہے۔ آپ روزانہ یہی پُوچھتی ہیں"۔

"لیکن آج میں خاص طور پر پُوچھ رہی ہوں کہ تم کہاں جا رہے ہو؟"

"آج کیا خاص بات ہے، ماں؟"

"بیٹے، تم اکیلے شکار کے لِیے جاتے ہو تو میرا دل مطمئن رہتا ہے۔ لیکن جب بشیر احمد تمہارے ساتھ جاتا ہے تو میرا دل گھبراتا ہے"۔

"وہ کیوں، ماں؟"

"وہ اِس لِیے کہ بشیر احمد اچھّا آدمی نہیں ہے۔ میں نے کبھی اُس کے مُتعلّق کوئی اچھّی بات کسی سے نہیں سُنی"۔

"ماں، وہ اچھّا آدمی ہے۔ فِکر نہ کیا کریں"۔

"وہ ایک بار چوری میں پکڑا گیا۔ ایک بار نذیر حُسین چکّی والے سے لڑ بیٹھا۔ ایک بار پڑوسن کی مُرغی چوری کی۔ اِن باتوں کی وجہ سے ابھی تک اُس کا بیاہ نہیں ہُوا، حال آں کہ اُس کی عُمر تین اُوپر تیس سال ہے"۔

"میرے ساتھ اُس کا سُلوک ٹھیک ٹھاک ہے۔ کوئی گڑبڑ کرے گا تو میں اُس کا ساتھ چھوڑ دوں گا" نور دین نے کہا۔ اُس روز نور دین برفانی چیتے کے شکار کے لِیے گھر سے نکلا تو راستے میں بشیر مِل گیا اور وہ بھی ساتھ ہولیا۔ وہ دونوں کافِر پہاڑ کی طرف چل دِیے جو بلتِستان اور لدّاخ کے درمیان سرحد پر ہے۔ یہ نومبر کا مہینا تھا اور برف باری شروع ہوگئی تھی۔ اُن کو شکار پر جاتے ہوئے پاکستانی فوج کے سپاہیوں نے دیکھا تھا۔ دوپہر کو اِن فوجیوں نے بندوق چلنے کی آواز سُنی اور جب وہ وہاں گئے تو نُور دین مرچکا تھا اور بشیر احمد سرحد پار کر کے ترتک گاؤں چلا گیا تھا۔ وہ دراصل بھارتی فوج کا جاسُوس تھا۔

فوجیوں نے نُور دین کی لاش اُس کی بوڑھی ماں کے سپُرد کر دی۔ بُڑھیا تو سکتے میں آگئی۔ اُس کے مُنہ سے آواز تک نہ نکلی۔ وہ دیر تک اپنے بیٹے کی لاش کو تکتی رہی۔ البتّہ نور دین کا کتّا ٹائیگر اُس کی لاش کو دیکھ کر بھونکتا رہا۔ وہ حیران تھا کہ اس کا مالِک اِس طرح کیوں لیٹا ہے اور وہ چُپ کیوں ہے۔

بلتی زبان میں نمبردار کو ترمپا کہا جاتا ہے۔ فرانو کا ترمپا نُور دین کی موت کا سُن کر آیا اور اُس کی ماں سے کہنے لگا "بی بی زینب، نُور دین کے کفن دفن کا اِنتظام کریں"۔

"نہیں۔ ابھی نہیں" زینب بولی۔

"یہ کام جتنی جلدی ہو جائے، اُتنا ہی اچھّا ہے، بی بی" ترمپا نے کہا۔

"نہیں۔ میں ابھی اپنے بیٹے کو اپنے سے جُدا نہیں کرنا چاہتی" زینب نے کہا۔

"تو کل صبح دفن کر دیں گے" ترمپا بولا۔

"نہیں، کل بھی نہیں" وہ بولی۔

"آج بھی نہیں اور کل بھی نہیں، تو پھر کب؟" ترمپا نے پُوچھا۔

"میں آپ کو بتا دُوں گی" زینب بولی۔

لوگ شام تک زینب کے گھر آ آکر افسوس کرتے رہے۔ سارا گاؤں غم گِین تھا، کیوں کہ نور دین نیک بھی تھا اور بہادُر بھی۔ وہ ایک بڑا شکاری تھا اور اُس نے اِتنی عُمر میں دو خوں خوار برفانی چیتوں اور پانچ مار خوروں کا شکار کیا

تھا۔ مارخور جنگلی بکرے ہوتے ہیں جو بلتستان اور بلوچستان میں ملتے ہیں اور جن کے مُتعلّق مشہور ہے کہ وہ سانپ کھا جاتے ہیں۔

رات کو سب لوگ افسوس کر کے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ نُور دین کی مَیّت چارپائی پر پڑی تھی۔ اُس کے ایک طرف ٹائیگر بیٹھا تھا جو بھونک بھونک کر اپنے مالک کو یاد کر رہا تھا اور دوسری طرف زینب بیٹھی تھی جس کے دل میں اِنتقام کا ایک طوفان برپا تھا۔ وہ بشیر احمد سے بدلہ لینا چاہتی تھی۔ "میں بدلہ لوں گی!" زینب نے ٹائیگر سے مُخاطِب ہوکر کہا "میں اپنے بیٹے کا بدلہ لوں گی" ٹائیگر آہستہ سے بھونکا اور خاموش ہوگیا۔ زینب نے مُٹھّیاں بھینچ لیں اور چلّائی "میں اپنے بیٹے نُور دِین کا بدلہ بشیر سے لُوں گی، ضرور لُوں گی"۔

ٹائیگر اِس بار زور سے بھونکا اور پھر چُپ ہوکر زینب کی طرف دیکھنے لگا جیسے کہ رہا ہو کہ میں آپ کا ساتھ دُوں گا۔ بُڑھیا نے ہاتھ اُوپر اُٹھائے اور مُنہ چھت کی طرف کر کے بولی "اے خدا! مجھے ہِمّت دے کہ میں اپنے اِکلوتے بیٹے کا بدلہ لے سکوں۔ مجھے توفیق عطا فرما!"۔

اب کے ٹائیگر خاموش رہا اور سر فرش پر رکھ کر خاموش بیٹھ گیا۔ لیکن زینب زار و قطار رونے لگی اور ساری رات روتی رہی۔

صبح کو امام مسجد نے اذان دی۔ نُور دین کی لاش اُسی طرح چارپائی پر پڑی تھی۔ ساڑھے پانچ فُٹ قد، گورا گول چہرہ، چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی، گلے میں کُرتا، کُرتے کے اُوپر بھُورے رنگ کا لمبا کوٹ، مٹیالے رنگ کی شلوار۔ کُرتا، کوٹ اور شلوار خون میں لِتھڑے ہُوئے تھے جو اَب سیاہی مائل ہوگیا تھا۔ بُڑھیا نے اُس کا ماتھا چوما اور بولی:

"میرے بیٹے، فِکر نہ کرو۔ میں تُمہارا بدلہ لُوں گی۔ میرے پیارے بچّے، یہ خیال مت کرنا کہ بشیر احمد میرے اِنتقام سے بچ جائے گا۔ وہ بھاگ کر "تورتک" پہنچ گیا ہے جہاں اُس کی حِفاظت بھارتی فوج کر رہی ہے کیوں کہ وہ اُس کا جاسوس ہے۔ مگر تم ذرا فِکر نہ کرو۔ تمہاری ماں زندہ ہے۔ وہ اپنے بچّے کا بدلہ لے گی، ضرور لے گی!"۔

وہ دوپہر تک چارپائی کے پاس بیٹھی رہی۔ پھر ترمپا آیا اور نور دین کی مَیّت قبرستان لے گیا۔ بُڑھیا تو گھر پر رہی لیکن ٹائیگر قبرستان تک گیا اور نور دین کی قبر دیکھ کر واپس آگیا۔ اگلے دن بُڑھیا پہلے قبرستان گئی اور بیٹے کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ ٹائیگر اُس کے ساتھ تھا۔ وہاں سے فارِغ ہوکر وہ ٹائیگر کے ساتھ اُس راستے پر ہو لی جو سرحد کی طرف جاتا تھا۔ جب وہ پاک فوج کے سرحدی مورچوں پر پہنچی تو ایک حوالدار نے اُسے روک کر پُوچھا:

"امّاں، کہاں جا رہی ہو؟"

"بیٹا، مجھے پہچانو۔ میں زینب ہُوں" بُڑھیا نے جواب دیا۔ "اچھا، اب سمجھا۔ آپ نُور دین شکاری کی ماں ہیں"۔

"ہاں' میں بہشتی نور دین کی ماں ہُوں' زینب"۔

"آپ اُس کی ماں ہی نہیں ہیں' ہماری ماں بھی ہیں" حوالدار بولا۔

"اللہ آپ کا بھلا کرے۔ میرے بیٹے کو بشیر احمد نے قتل کیا ہے اور وہ تورتک بھاگ گیا ہے"۔

"کیسے پتا چلا کہ وہ تورتک میں ہے؟" حوالدار نے پُوچھا۔

"1971ء کی لڑائی کے وقت ہم تورتک میں رہتے تھے اور بشیر احمد ہمارا پڑوسی تھا۔ جب لڑائی شروع ہوئی تو ہم وہاں سے فرانو آگئے۔ بشیر احمد نُور دین کو قتل کر کے تورتک چلا گیا ہے"۔

"اب آپ کہاں جا رہی ہیں' ماں؟" حوالدار نے پُوچھا۔

"میں وہ جگہ دیکھنے جا رہی ہوں جہاں میرا بیٹا قتل ہُوا تھا"۔

حوالدار خاموش رہا اور بُڑھیا کتّے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ جب وہ پاکستانی سرحد پار کر کے بھارتی فوج کے مورچوں کے پاس پہنچی تو ایک بھارتی کپتان نے اُسے روک کر کہا "بُڑھیا! کہاں جا رہی ہے؟"

"میں تورتک جانا چاہتی ہُوں"۔

"کیوں؟"

"وہ میرا گاؤں ہے۔ میں 1971ء سے پہلے وہاں رہتی تھی" زینب بولی۔

"لیکن اب وہ ہمارے قبضے میں ہے۔ تُم وہاں نہیں جا سکتیں" کپتان نے ڈانٹ کر کہا۔ زینب نے کوئی بات نہ کی اور واپس گھر آگئی۔

زینب کی عمر 55 سال سے اُوپر تھی۔ اُس کی مدد کرنے والا کوئی نہ تھا۔ نہ بھائی' نہ بیٹا' نہ کوئی اور رشتے دار۔ وہ کرے تو کیا کرے؟ اپنے بیٹے کے قاتل کو کیوں کر سزا دے؟ وہ دن رات یہی سوچتی رہتی۔ اُٹھتے بیٹھتے اُسے اپنے بیٹے کے بدلہ کا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اُس کی زندگی تھوڑی ہے۔ قبر کے کنارے بیٹھی ہے۔ لیکن وہ مرنے والے سے وعدہ کر چکی ہے کہ وہ اُس کا بدلہ لے گی۔ مگر کیسے؟ ٹائیگر اُس کی چارپائی کے نیچے بیٹھا رہتا۔ وہ اپنے مالک کو یاد کر کے بھونکتا تھا۔ اگر وہ اُسے کہتی چُپ ہو جا تو وہ چُپ ہو جاتا اور اگر وہ اُس سے بدلے کے مُتعلق باتیں کرتی تو وہ اپنے حلق سے ایسی آوازیں نکالتا جیسے وہ اُس کی بات سمجھ رہا ہو۔

زینب نے ایک مُرغ پال رکھا تھا۔ اُس نے سوچا کہ نُور دین کے چہلم پر وہ مُرغ کو ذبح کرے گی اور غریب بچّوں کو کھانا کِھلائے گی تاکہ نوردین کی رُوح کو ثواب پہنچے۔ اِس غرض کے لِیے اُس نے مُرغ کو پکڑنا چاہا تو وہ اُس کے قابُو میں نہ آیا۔ وہ اُس کے پیچھے بھاگ بھاگ کر تھک گئی۔ آخر اُس نے ٹائیگر سے مُرغ کی طرف اِشارہ کر کے کہا "پکڑو اِسے!" ٹائیگر بھاگا اور مُرغ کو پکڑ کر زینب کے پاس لے آیا۔

یہ دیکھ کر زینب کو خیال آیا کہ بدلہ لینے میں ٹائیگر کی مدد حاصِل کی جا سکتی ہے۔ وہ اِس بات پر دو دِن سوچتی رہی اور آخر اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ نُور دِین کا بدلہ ٹائیگر کی مدد سے لے گی۔

مُرغ کے ذبح ہونے کے بعد اُس کا دڑبا خالی پڑا تھا۔ دڑبے کے ساتھ ہی امرُود کا درخت تھا۔ زینب نے اُس کے ساتھ ٹائیگر کو باندھ دیا۔ رات کو سردی ہوتی تو ٹائیگر دڑبے کے اندر سو جاتا' جہاں زینب نے ایک پُرانا لحاف رکھ دیا تھا تاکہ اُسے سردی نہ ستائے۔

ٹائیگر درخت سے بندھا بھونکتا رہا اور جب اُسے سردی نے ستایا تو وہ دڑبے کے اندر گھُس گیا اور صبح تک بھونکتا رہا۔ صبح کو زینب نے اُس کے سامنے پانی کا پیالہ رکھا لیکن کھانے کو کچھ نہ دیا۔ ٹائیگر نے پانی پیا اور کھانے کا اِنتظار کرتا رہا۔ لیکن اُسے کھانے کو کچھ نہ ملا۔ وہ سارا دِن بھُوکا رہا۔

زینب اُس روز پڑوس کے دو تین گھروں میں گئی اور

وہاں سے دھان کے سُوکھے ڈنٹھل جن کو پیال (پرالی) کہا جاتا ہے' لے آئی- کچھ گھاس پُھوس اُس کے گھر میں پہلے سے موجود تھا- وہ سارا دن اور ساری رات پیال اور گھاس پھوس سے اِنسانی ڈھانچا تیّار کرنے میں لگی رہی- جب صبح ہوئی تو ایک چھوٹے سے اِنسان کا ڈھانچا تیّار ہو چکا تھا- زینب کے پاس تھوڑا سا مُرغ کا گوشت بچا ہُوا تھا- وہ اُس نے ڈھانچے کے گلے میں باندھا اور پھر ٹائیگر کی زنجیر کھول کر ڈھانچے کی طرف اِشارہ کر کے کہا "پکڑو اِسے!"-

ٹائیگر نے لپک کر اِنسانی ڈھانچے کو دبوچ لیا اور اُس کے گلے میں بندھی ہوئی مُرغ کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھانے لگا- زینب کی خوشی کی حد نہ رہی- اُس کا تجربہ کام یاب رہا تھا- اب وہ اپنے صحن میں امرود کے درخت سے ٹائیگر کو باندھ دیتی' اُسے پانی پِلاتی لیکن دو دِن بُھوکا رکھتی- پھر گائے کا گوشت ڈھانچے کے گلے میں باندھ کر ٹائیگر سے کہتی "پکڑو اِسے!"

یہ تجربہ دو مہینے جاری رہا اور ٹائیگر زینب کے اِشارے کا عادی ہوگیا- اُسے اِشارے اور حکم کا مُعاوَضہ بھی ملتا تھا اور وہ تھا گوشت جس سے اُس کی بھوک مِٹ جاتی تھی- اب جب بھی ٹائیگر اِنسانی ڈھانچے کو دیکھتا تو غُراتا اور پھر زینب کی طرف دیکھ کر اُس کے اِشارے کا اِنتظار کرتا- اگر وہ اشارہ کر کے کہتی "پکڑو!" تو وہ حملہ کر دیتا-

اور پھر ایک رات جب برف باری ہو رہی تھی اور بھارتی فوجی اپنے مورچوں میں دبکے بیٹھے تھے' زینب ٹائیگر کے ساتھ سرحد پار کر کے تور تک پہنچ گئی-

یہ زینب کا اپنا گاؤں تھا اور وہ اِس کے چپّے چپّے سے واقف تھی۔ جلد ہی وہ بشیر احمد کے دروازے پر پہنچ گئی اور آہستہ سے دروازہ کھٹ کھٹایا۔ اندر سے کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ وہ کُتّے کو لے کر پیچھے ہٹ گئی۔ بشیر احمد نے دروازہ کھولا۔

"بشیر؟" زینب نے پُوچھا۔

"ہاں، میں بشیر ہُوں" وہ بولا۔

زینب نے اُس کی آواز پہچان لی اور پھر ٹائیگر کو اِشارہ کر کے زور سے کہا "پکڑو اِسے!"

ٹائیگر نے چھلانگ لگائی اور بشیر کے گلے کو دبوچ لیا۔

جب سُورج نکلا اور روشنی چاروں طرف پھیل گئی تو تورتک کے لوگوں نے دیکھا کہ بشیر کا دھڑ اور سر تو گلی میں پڑے ہیں لیکن گردن کا نام نشان نہیں ہے۔

جس وقت لوگ تورتک کی گلی میں بشیر کی لاش دیکھ رہے تھے، زینب ٹائیگر کی زنجیر تھامے پاک فوج کے حوالدار کو بتا رہی تھی کہ اُس نے اپنے بیٹے نُور دین کا بدلہ لے لیا ہے۔ اور حوالدار نے اُس کی بات سُن کر دِل میں کہا تھا "بُڑھیا پاگل ہے!"۔

جھُولتا طوطا

طوطے کے اِن دونوں حِصّوں کو قینچی سے، چاروں طرف سے، کاٹیے۔ پھر ایک حِصّہ گتّے پر گوند سے چپکا دیجیے۔ (گوند زیادہ نہ لگائیے)۔

اِس کے بعد گتّے کو چاروں طرف سے کاٹیے اور پھر پہلے حصّے کے پیچھے دُوسرا حِصّہ چپکا دیجیے۔

اب اِسے کسی گول ڈنڈے پر پنجوں کے بل کھڑا کر دیجیے۔ آپ اِس کی دُم پر، ہلکے سے، اُنگلی ماریں گے تو یہ آگے پیچھے جھُولے گا۔

مُجرم کون؟

گرینڈ ہوٹل میں، ہر دُوسرے تیسرے دِن، کسی نہ کسی مُسافِر کے کمرے سے، کوئی نہ کوئی چیز چوری ہو جاتی۔ مینجر نے چور کا کھوج لگانے کی بہُت کوشش کی، لیکن ناکام رہا۔ آخر تنگ آکر اُس نے ایک سُراغ رساں، اِنسپکٹر سعید، کی خِدمات حاصِل کیں۔

اِنسپکٹر سعید ہوٹل کے ایک کمرے میں بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ پھر کوئی شخص آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر آیا، لیکن اِنسپکٹر کو دیکھ کر، گھبرا کر، بولا "اوہ! معاف کیجیے۔ میں سمجھا یہ میرا کمرا ہے"۔ اِنسپکٹر نے فوراً اُسے دبوچ لیا۔

اب آپ یہ بتائیے کہ اِنسپکٹر سعید کو یہ کیسے معلوم ہُوا کہ یہی شخص چور ہے؟ خوب سوچیے، بلکہ اپنی سوچ میں گھر والوں کو بھی شامل کرلیجیے، اور 10 جنوری تک اپنا جواب لکھ کر ہمیں بھیج دیجیے۔ صحیح جواب دینے والے ساتھی کو 500 روپے کی کتابیں دی جائیں گی۔ جواب کے ساتھ کوپن آنا ضروری ہے (کوپن صفحہ 56 پر دیا گیا ہے)۔

دسمبر 1994ء کے بِلا عُنوان کا نتیجہ اور اِنعام پانے والے ساتھیوں کے نام صفحہ 56 پر دیکھیے۔

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore

PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES

Price Rs. 10.00